ISSN 2581-5482

سہ ماہی ادبی نشیمن

مارچ تا مئی ۲۰۲۱ء

قیمت: ۲۵/روپے



فضل امام رضوی



شمس الحق نادوی



ظفر احمد صدیقی

ایڈیٹر

ڈاکٹر سلیم احمد



مقبول ومعروف شاعراور مضمون نگارسلیم انصاری کے لکھنؤ آمد پران کی ادبی خدمات کے اعتراف میں
ادبی نشیمن کے دفتر میں پروفیسر محمود الٰہی ایوارڈ سے نوازتے ہوئے۔



سلام لکھنؤ آئینہ ثقافت کی جانب سے مدیرادبی نشیمن کو صحافی اودھ ایوارڈ سے نوازتے ہوئے ڈاکٹر امنگ کھنہ۔



پریس کلب لکھنؤ میں منعقد ایک تقریب میں شخصیتِ اودھ اعزاز حاصل کرتے ہوئے۔

مارچ تا مئی ۲۰۲۱ء
ISSN 2581-5482
جلد : ۴
شمارہ : ۲

سہ ماہی

ادبی نشیمن

ADBEE NASHEMAN

Email
adbeenasheman@gmail.com

قیمت

فی شمارہ : ۲۵/روپئے
سالانہ ممبرشپ مع رجسٹرڈ ڈاک : ۱۲۵/روپئے
بیرونی ممالک (ہوائی ڈاک) : 15 $ (امریکی ڈالر)
لائف ٹائم ممبرشپ : دو ہزار روپئے
لائبریری/ادارہ کیلئے : ۶۵/روپئے فی شمارہ

ترسیل زر (منی آرڈر) کا پتہ

سہ ماہی ادبی نشیمن
168/C-544، الماس باغ، ہردوئی روڈ، لکھنؤ 226003

Bank Detail

Name : Adbee Nasheman
Bank : Allahabad Bank, Lucknow
Branch : Balaganj
A/c No. : 50489096237
IFSC : IDIB000L558

Address

Editor Urdu Quarterly
ADBEE NASHEMAN
544-C/168, Almasbagh
Hardoi Road, Lucknow-03

ایڈیٹر

ڈاکٹر سلیم احمد

Mob.: 8707260591, 9415693119
saleemahmad110@gmail.com

ادبی مشیر

رفعت عزمی

Mob.: 9451818310
rafatsafavi@gmail.com

مجلس ادارت

- ڈاکٹر غلام حسین (اجین)
- ڈاکٹر رضی الرحمٰن (گورکھپور)
- ڈاکٹر شکیل احمد (مئو)
- ڈاکٹر اکبر علی بلگرامی
- وصی اللہ حسینی (لکھنؤ)

'ادبی نشیمن' میں شائع ہونے والے تمام مشمولات میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے اس کی ساری ذمہ داری مصنف کی ہوگی۔
ادارے کا متفق ہونا لازمی نہیں ہے۔

پرنٹر، پبلشر اور پروپرائٹر احمد رشیق نے نعمانی پرنٹنگ پریس، بارودخانہ، گولہ گنج، لکھنؤ سے چھپوا کر 168/C-544، الماس باغ، ہردوئی روڈ، لکھنؤ سے شائع کیا۔
ایڈیٹر: ڈاکٹر سلیم احمد

فہرست عناوین

آغاز

۱ حمد باری ونعت ..... عادل بنارسی، ساحرؔ داؤدنگری ۳

اداریہ

۲ نظریہ ..... ایڈیٹر ۴

گوشۂ شمس الرحمن فاروقی

۳ شمس الرحمٰن فاروقی اور لکھنؤ ..... شاہنواز قریشی ۶

۴ شمس الرحمٰن فاروقی کی افسانہ نگاری ..... ڈاکٹر رشید اشرف خان ۹

۵ شمس الرحمٰن فاروقی پر ایک نوٹ ..... ذاکر حسین ذاکر ۱۵

۶ قطعۂ تاریخ وفات ..... ڈاکٹر رؤف خیر ۱۷

۷ شمس الرحمٰن فاروقی اب کہاں ..... ڈاکٹر سعید گورکھپوری ۱۸

گوشۂ ظفر احمد صدیقی

۸ پروفیسر ظفر احمد صدیقی (رفتید و لے نہ از دلِ ما) ..... ڈاکٹر شکیل احمد ۱۹

۹ پروفیسر ظفر احمد صدیقی: کچھ یادیں ..... عبدالرزاق ۲۳

گوشۂ فضل امام رضوی

۱۰ زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے ..... ڈاکٹر اکبر علی ۲۵

۱۱ فضل امام پروستار مولانا ابوالکلام ..... ڈاکٹر ریحان حسن ۲۷

۱۲ قطعۂ تاریخ وفات ..... ڈاکٹر مخمور کاکوروی ۳۰

مضامین

۱۳ کیرالا میں اردو کا فروغ ..... کے. پی. شمس الدین ۳۳

۱۴ اردو شعر وادب میں ندا فاضلی کی امتیازی حیثیت ..... عرفان اللہ ۴۰

۱۵ ناندیڑ کے بزرگ شاعر محترم راہیؔ صاحب ..... اختر صادق ۴۴

۱۶ محمد منظر الحق صدیقی کی شاعری (نظر نظر منظر کے حوالے سے) ..... ڈاکٹر ریحان احمد قادری ۴۷

۱۷ ماضی میں اردو کا خوش نما جزیرہ: جاؤرہ ..... سید سرور علی ۵۱

۱۸ علامہ اقبال کی شاعری اور گنگا جمنی تہذیب ..... آصف پرویز ۶۳

افسانے

۱۹ چاہتوں کی بازگشت ..... ندیم راعی ۶۷

۲۰ عقلمند لکڑہارا ..... عطیہ نفیس ۷۰

غزلیات

۲۱ غزل ..... احبار الٰہی، بابا آزاد جرولی ۳۱

۲۲ غزل ..... ڈاکٹر اختر ریاض، ظفر اقبال ظفر ۳۲

تبصرے

۲۳ باتیں سخن کی ..... تصنیف: ڈاکٹر عمیر منظر ..... مبصر: عمران عاکف خان ۷۱

□□□

عادلؔ بنارسی

حمد باری

یا خدا ہے تری ذات عالی وقار
تیری رحمت سے دنیا ہے باغ وبہار
ہے تو ہی سارے عالم کا پروردگار
سب ہیں بندے ترے سب کا معبود تو
سارے عالم کو ہے بس تری جستجو
نام ہے تیرا سب کے دلوں کا قرار
ہر چرند وپرند اور شمس وقمر
آسماں پر ملائک زمیں پر بشر
بندگی تیری کرتے ہیں لیل ونہار
لفظ کن کہہ کے عالم کو پیدا کیا
بحروبر چاند سورج یہ ارض وسما
مصطفی تیری قدرت کے ہیں شاہکار
تیری رحمت کی حد ہی نہیں اے خدا
یہ عطا ہے تری، اس کا تو ہوگیا
کردیا جس نے تجھ پہ دل وجاں نثار
مومنو کے لیے ہوگا روزِ سعید
دیکھ کر تجھ کو ہوجائے گی ان کی عید
جب تو جلوہ نما ہوگا روزِ شمار
تیرا عادل بڑا ہی گنہگار ہے
یا الٰہی تو ستار وغفار ہے
بخش دے ہر خطا مرے پروردگار

ساحرؔ داؤدنگری

نعت

اس طرح جادو بیانی ہوگئی
زندگی کی کامرانی ہوگئی

روز محشر میں سفارش آپ کی
میری بخشش کی نشانی ہوگئی

تذکرہ تھا سیرت و کردار کا
شخصیت ہی ترجمانی ہوگئی

عہد نو میں بھی بیاں ان کے جدید
ہر کہانی اب پرانی ہوگئی

رک گئی ہے کفر و بدعت کی ہوا
جب نبی کی باغبانی ہوگئی

سرور کون ومکاں کی بات پر
زندگی بھی جاودانی ہوگئی

فلسفۂ ساحرؔ سمجھ میں آ گیا
اب ہوائے دل نہانی ہوگئی

نظریہ



سال 2020 تمام تر پریشانیوں اور عالمی وبا کے ساتھ جس دھوم دھام کے ساتھ گزرا اور اپنے منحوس اثرات جہاں تمام شعبوں پر چھوڑے وہیں اردو ادب بھی اس سے اچھوتا نہیں رہا۔ اس وبا نے اردو ادب کی ایسی ایسی شخصیات کو اپنے آغوش میں لے لیا جس کی کمی عرصہ دراز تک پوری نہیں ہوسکتی۔ مجموعی طور پر گزشتہ برس کا شمار تاریخ میں منحوس سال کے طور پر ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ اس برس بہت سی نامور شخصیات کے ساتھ شمس الرحمن فاروقی ، پروفیسر ظفر احمد صدیقی اور پروفیسر فضل امام وغیرہ عالمی شہرت یافتہ محقق و نقاد اور ادیب وخطیب بھی ادب کو داغ مفارقت دے گئے۔

25 دسمبر 2020 کو اردو کے نامور ناقد، محقق اور ادیب، افسانہ و ناول نگار ساہتیہ اکادمی ایوارڈ، سرسوتی سمان اور پدم شری شمس الرحمن فاروقی کا انتقال اردو کے ایک عہد کا سانحہ ہے۔ انھوں نے یوں تو بہت سے اصناف پر اپنی علمی صلاحیت کو بکھیرا ہے مگر اردو ادب میں انکی خاص شناخت اور مقبولیت ایک ناقد کے طور پر ہوتی ہے وہ اردو کے ایک عہد ساز شخصیت تھے۔ تنقید اور تحقیق کے میدان میں وہ خود میں دبستان کی حیثیت رکھتے تھے۔ 1990 کے دہائی میں فاروقی صاحب نے فرضی ناموں سے افسانہ تحریر کیا جو بے حد مقبول ہوا مگر جب ان کے افسانوں کا مجموعہ "سوار اور دوسرے افسانے" شائع ہوئے تب لوگوں کو ان کے افسانوں کا علم ہوا۔ اسی طرح 39 برسوں تک پابندی سے شایع ہونے والے شب خوں پر بطور مدیر اپنا نام شایع نہیں کیا۔ انھوں نے شب خوں کے ذریعہ جدیدیت کے رجحان کو عام کرنے میں غیر معمولی کارنامہ انجام دیا۔ تفہیم غالب، شعر شور انگیز، گنج سوختہ، لفظ و معنی، سوار اور دوسرے افسانے، کئی چاند سر آسماں، دا میر بیوٹی، آسمان محراب وغیرہ ان کی بے حد اہم کتابیں ہیں۔ ان کا اصل میدان تنقید رہا حالانکہ انہوں نے جس صنف پر قلم اٹھایا اسے حتمی شکل تک پہنچایا۔ ان کی رحلت ہندوستانی ادب کا بڑا خسارہ ہے جو مستقبل قریب میں پر ہونا مشکل رہے۔

پروفیسر ظفر احمد صدیقی تقریباً 40 برس تک درس وتدریس کے شعبہ سے وابستہ تھے۔ وہ تقریباً 18 برس تک بنارس یونیورسٹی اور 23 برس تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے وابستہ رہے۔ ان کا اصل میدان تحقیق تھا۔ ان کا شمار ادب میں ایک بڑے محقق کے طور پر ہوتا تھا۔ انہوں نے کلاسیکی شاعری کے ان پہلوؤں پر روشنی ڈالی جن کو ابھی تک نظر انداز کیا جاتا رہا۔ ملک و بیرون ملک میں ان کے تقریباً 531 مقالے شایع ہوئے۔ مختلف سیمیناروں میں 331 کلیدی اور صدارتی خطبے پیش کیے۔ ان کی مختلف کتابوں میں تنقیدی معروضات، شبلی، شبلی کی علمی و ادبی خدمات، نظم طباطبائی، قصیدہ اصل ہیت اور حدود، شبلی معاصرین کی نظر میں، شرح دیوان اردوئے غالب، افکار و شخصیات، مولانا شبلی بحیثیت سیرت نگار، تحقیقی مقالات، نقش معانی ابتدائی عربی وغیرہ اہم ہیں۔ موصوف کی نگرانی میں بیس لوگوں نے ایم فل اور پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی جب کہ ابھی کئی اسکالرکو ڈگری ملنی باقی ہے۔ 29 دسمبر کو وہ بھی اس دار فانی سے رخصت ہو گئے۔

پروفیسر محمود الٰہی صاحب کے بے حد عزیز شاگردوں میں ایک نام مشہور ناقد ادیب پروفیسر فضل امام صاحب کا ہے جو اردو کے علاوہ فارسی، عربی، ہندی اور سنسکرت زبان پر بھی دسترس رکھتے تھے۔ آپ نے گورکھپور یونیورسٹی سے امیر اللہ تسلیم حیات اور شاعری پر تحقیقی مقالہ اور انیس شخصیت اور فن پر ڈی لٹ کیا۔ 1972 میں مہارانی کنور پی جی کالج بلرام پور سے تدریسی سفر شروع کیا۔ 1973 میں جے پور یونیورسٹی میں صدر شعبہ اور 1986 میں الہ آباد یونیورسٹی آ گئے۔ امیر اللہ تسلیم حیات اور شاعری، انیس شخصیت اور فن، جدید مرثیہ، انیس شناسی، افکار و نظریات، شاعری آخر الزماں، جوش ملیح آبادی، مشرقی انتقادیات: اصول و نظریات، جدید ہندی شاعری بھوجپوری ادب کا تعارف، اردو شناسی وغیرہ کے علاوہ ہندی اور انگریزی میں کئی کتابیں ان کی شخصیت کی عکاسی ہیں۔ 31 اگست کو وہ بھی رحلت فرما گئے۔

طنز و مزاح نگار مجتبیٰ حسین، ممبئی یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر صاحب علی، کہاں ہے میرا ہندوستان کے خالق اجمل سلطانپوری، گنگا جمنی تہذیب کے علمبردار گلزار دہلوی، عالمی شہرت یافتہ شاعر راحت اندوری، ممتاز اور سنجیدہ شاعر کبیر اجمل، طنز و مزاح اور صحافی نصرت ظہیر، شاعر، ادیب وصحافی احمد عرفان، ترقی پسند ادیب اور ناقد پروفیسر افصح ظفر، کہنہ مشق شاعر علوی، مجاہد اردو انور مسعود خاں، رسالہ نور ادب اطفال کے مدیر مرتضیٰ ساحل۔ شاعر، نقاد اور محقق سید عظیم حیدر عظیم امروہوی بھی داغ مفارقت دے گئے۔ معروف اسلامی اسکالر اور ماہر لسانیات مولانا کلب صادق صاحب طویل علالت کے بعد اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ اسی کڑی میں نامور شاعر و ادیب ڈاکٹر حنیف ترین، نظم نگاری کے معروف و مقبول شاعر رہبر جونپوری، جامعہ ازہر سے پی ایچ۔ ڈی کرنے والے اور قرآن مجید کی انسائیکلو پیڈیا تیار کرنے والے پروفیسر ضیا الرحمن اعظمی بہت سے معروف وغیر معروف ادیب و نقاد اور شعرا کے انتقال پر ادبی نشیمن انہیں خراج عقیدت پیش کرتا ہے۔

ڈاکٹر سلیم احمد

مارچ تا مئی ۲۰۲۱ء



گوشۂ شمس الرحمٰن فاروقی

(۳۰ ستمبر ۱۹۳۵ء — ۲۵ دسمبر ۲۰۲۰ء)

شمس الرحمٰن فاروقی اور لکھنؤ



شاہنواز قریشی

سابق ایڈیٹر 'نیا دور'
لکھنؤ

اردو کے بت شکن اور انتہائی Voilent نقاد شمس الرحمن فاروقی، انیس اشفاق کے مطابق 1968ء میں اپنی ملازمت کے سلسلے میں لکھنؤ آ گئے تھے۔ لیکن میں نے انہیں سب سے پہلے اس جلسے میں دیکھا اور سنا جو پروفیسر احتشام حسین کی یاد میں لکھنؤ کے گنگا پرشاد میموریل ہال امین آباد میں منعقد ہوا تھا۔ یہ غالباً دسمبر 1972ء کی بات ہے۔ اس جلسے میں اظہار خیال کرتے ہوئے فاروقی صاحب نے احتشام صاحب سے اپنے بعض (نظریاتی) اختلافات کا ذکر بھی کیا تھا۔ اس پر جلسے میں موجود ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد نے کہا کہ یہ اس کا موقع نہیں ہے کہ یہاں اختلافات کا ذکر کیا جائے۔ فاروقی صاحب نے بہت ہی Voilently اس کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ اختلاف بھی اسی سے کیا جا سکتا ہے۔ جس میں کچھ دم ہوتا ہے اور ہمیشہ اتفاق کرنا مکاری ہے۔ فاروقی صاحب نے اپنی تقریر میں پروفیسر احتشام حسین کے مطالعے اور علمیت کا اعتراف کیا تھا۔ انہوں نے احتشام صاحب کی غزل۔

اک پندارِ خودی جس کو بچا رکھا تھا
آج ہم وہ بھی تری بزم میں ہار آئے ہیں

سنائی تھی۔ انہیں اس غزل کے سارے اشعار یاد تھے۔

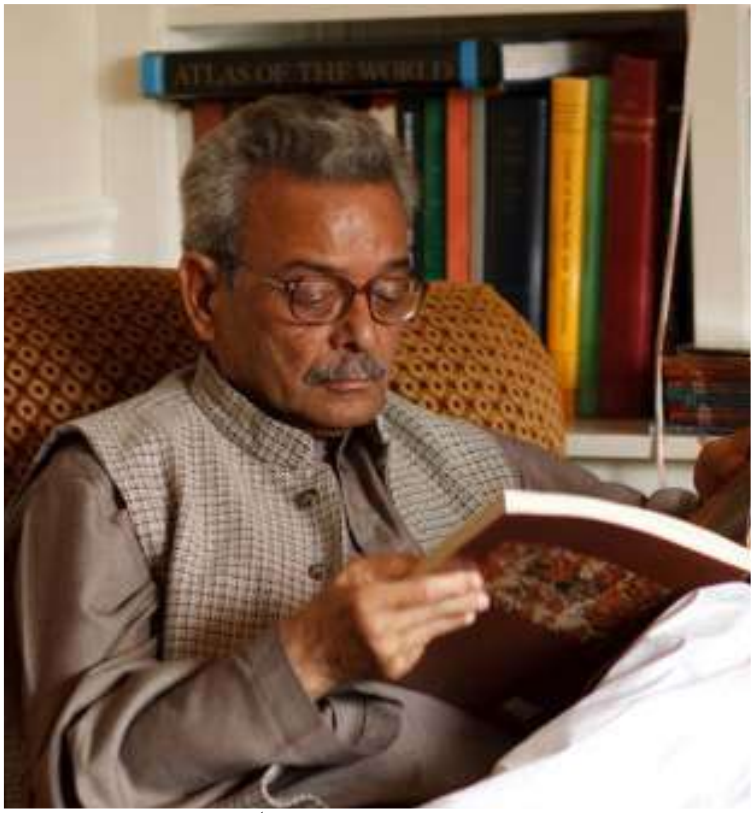
لکھنؤ کی ایک انتہائی فعال ادبی تنظیم بزم ادب نوازاں کے زیر اہتمام لکھنؤ یونیورسٹی کے ایک شعبے کے میٹنگ ہال میں غزل خاص طور سے نئی غزل اور اس کی خصوصیات پر اپریل 1975ء میں ایک بڑا ادبی جلسہ منعقد ہوا۔ جس کی صدارت پروفیسر شبیہ الحسن نونہروی نے کی۔ شمس الرحمن فاروقی نے اس جلسے کا افتتاح کرتے ہوئے نئی اردو غزل کی خصوصیات پر بھرپور روشنی ڈالی تھی۔ انیس اشفاق نے جدید اردو غزل پر ایک طویل مقالہ اس جلسے میں پڑھا۔ بعد میں اس جلسے میں نئی غزل پر بڑی خیال انگیز بحث ہوئی تھی۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اس مضمون میں صرف انہی نشستوں اور جلسوں کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ میں جن میں خود موجود تھا۔

ورنہ لکھنؤ میں اپنے قیام کی مدت کے دوران فاروقی صاحب اور بھی بہت سے جلسوں اور نشستوں میں شریک ہوتے رہے تھے۔

یوپی پریس کلب میں منعقدہ ایک بڑے جلسے میں قمر احسن کے پہلے افسانوی مجموعے ''آگ الاؤ اور صحرا'' کی رسم اجرا انجام دی گئی۔ جلسے کی صدارت عمیق حنفی نے کی تھی اور نظامت انیس اشفاق نے۔ جلسے میں فاروقی صاحب بھی موجود تھے۔ صدارتی تقریر میں عمیق حنفی نے بڑا معنی خیز اور ظریفانہ جملہ کہا کہ میں ماس میڈیا کا آدمی ہوں۔ شمس الرحمن فاروقی ماس کمیونیکیشن کے آدمی ہیں۔ لیکن ہم دونوں جدید ادب کے چکر میں پڑ کے ترسیل کی ناکامی کے المیے کا شکار ہو گئے۔

بزم ادب نوازاں کی ایک اور نشست میں بھی فاروقی صاحب شریک ہوئے تھے۔ جو بزم کے جنرل سکریٹری جمیل الرحمن (مرحوم) کی رہائش گاہ واقع باغ منوگھسیاری منڈی (لکھنؤ) میں ہوئی تھی۔ اس نشست میں مرحومہ بیگم نسیم اقتدار علی نے ایک افسانہ سنایا تھا۔ جس پر سخت تنقید ہوئی تھی جس کے تحت کہا گیا تھا کہ آج اردو افسانہ بہت آگے جا چکا ہے۔ لیکن نسیم صاحبہ کا یہ افسانہ بہت پیچھے نظر آتا ہے اور روایتی قسم کا ہے۔ اس تنقید کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے فاروقی صاحب نے کہا تھا کہ یہاں افسانے کے حوالے سے بہت خیال انگیز باتیں کہی گئی ہیں۔

نیر مسعود کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''عطر کافور'' شائع ہوا تو اس کے اجراء کا جلسہ یوپی اردو اکادمی (قیصر باغ) میں منعقد ہوا۔ جس میں شمس الرحمن فاروقی بھی شریک ہوئے تھے۔ اس موقع



پر سبھی مقررین نے نیّر صاحب کے افسانوں کی زبردست ستائش کی۔ انیس اشفاق نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ''نیر صاحب سے اچھی نثر پورے

یوپی پریس کلب میں منعقدہ ایک بڑے جلسے میں قمر احسن کے پہلے افسانوی مجموعے ''آگ الاؤ اور صحرا'' کی رسم اجرا انجام دی گئی۔ جلسے کی صدارت عمیق حنفی نے کی تھی اور نظامت انیس اشفاق نے۔ جلسے میں فاروقی صاحب بھی موجود تھے۔ صدارتی تقریر میں عمیق حنفی نے بڑا معنی خیز اور ظریفانہ جملہ کہا کہ میں ماس میڈیا کا آدمی ہوں۔ شمس الرحمن فاروقی ماس کمیونیکیشن کے آدمی ہیں۔ لیکن ہم دونوں جدید ادب کے چکر میں پڑ کے ترسیل کی ناکامی کے المیے کا شکار ہو گئے۔

برصغیر میں نہیں لکھی جا رہی ہے۔ اس پر جلسے میں موجود احمد ابراہیم علوی نے فقرہ کسا..... اشرف آباد کو آپ برصغیر کہہ رہے ہیں۔ مزید ستم ڈھایا فاروقی صاحب کی تقریر نے۔

انہوں نے کہا..... انیس اشفاق نے مبالغے سے کام لیا ہے۔ دراصل یہ استادی۔ شاگردی کا معاملہ ہے۔ جہاں تک نیر مسعود کے افسانوں کا تعلق ہے۔ ان میں کوئی شے سیدھی ہے ہی نہیں۔ ان افسانوں سے کوئی میسیج نہیں برآمد ہوتا۔ یہاں تک کہ یہ میسیج بھی نہیں ملتا کہ صبح سویرے اٹھ کر دانت اچھی طرح صاف کر لینا چاہیے۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اسی زمانے میں لکھنؤ آئے تو وہ نیر مسعود کی رہائش گاہ ادبستان بھی گئے۔ اس موقع پر وہاں نئے اردو افسانے پر

ایک مذاکرہ منعقد ہوا۔ جس میں شمس الرحمن فاروقی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، مسیح الحسن رضوی، رام لعل، عابد سہیل اور صباح الدین عمر شریک ہوئے۔ ان کے علاوہ شہنشاہ مرزا، وقار ناصری، انیس اشفاق، راقم السطور اور محمد مسعود بھی موجود تھے۔ اس موقع پر میں نے یہ سوال اٹھایا تھا کہ نئے افسانے کی تفہیم کے لیے کیا اس کی بھی شرح لکھی جایا کرے گی۔ کیونکہ اسے وہ بھی نہیں سمجھ پاتے جو خود جدید عہد اور جدید ذہن کے لوگ ہیں۔ اس سوال کو فاروقی صاحب نے یہ کہہ کر رد کر دیا تھا کہ ''یہ ایک مفروضہ ہے کہ جدید عہد اور جدید ذہن کے لوگ بھی اسے نہیں سمجھ پاتے۔ ہوسکتا ہے ایسے لوگ ذہنی طور پر جدید عہد کے نہ ہوں۔'' لیکن نارنگ صاحب نے اس سوال کی اہمیت اور اس پر غور وخوض کی ضرورت کو تسلیم کیا تھا۔

ہندی۔ اردو ادب ایوارڈ کمیٹی کے مجاز سیمینار میں علی سردار جعفری اور شمس الرحمن فاروقی بھی شریک ہوئے تھے سیمینار میں فاروقی اور جعفری صاحب میں زوردار بحث مجاز کے سلسلے میں چھڑ گئی تھی۔ فاروقی صاحب نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ مجاز اور ساحر لدھیانوی جیسے شعراء ہمارے آئیڈیل نہیں ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ اعتراف بھی کیا تھا کہ مجاز کی نظم آوارہ میں ایک فورس تو ہے۔ اس کے باوجود انہوں نے مجاز کو بڑا شاعر تسلیم کر لینے سے انکار کرتے ہوئے کہا تھا کہ مجاز سے بڑے شاعر تو خود علی سردار جعفری ہیں۔

فاروقی صاحب لکھنؤ میں قیام کے بعد جب یہاں سے جانے لگے تو لکھنؤ والوں کی جانب سے انہیں الوداعیہ دیا گیا جس میں لکھنؤ کے ان جیّد لوگوں نے بھی انہیں خراج تحسین پیش کیا جو گفتگو میں فاروقی کو رد کرتے ہوئے ہمیشہ یہ کہتے رہے کہ اردو ادب کو جتنا نقصان فاروقی نے پہنچایا ہے اتنا اور کسی نے نہیں۔ جلسے کے

فاروقی صاحب خاصی مدت تک لکھنؤ میں رہے۔ لکھنؤ میں اپنے قیام کے دوران وہ نیر مسعود سے بہت قریب ہوگئے۔ حالانکہ دونوں میں مختلف ادبی معاملات میں اختلافات بھی تھے۔ عطر کافور کے افسانوں پر منفی تبصرہ کرنے کے باوجود وہ نیر صاحب کی علمیت اور وسیع مطالعے کے معترف تھے۔ نیر صاحب کے علاوہ وہ عابد سہیل کو بھی خاصی اہمیت دیتے تھے۔ اگرچہ عابد سہیل ترقی پسند بلکہ Leftist تھے۔ جب کہ فاروقی ہمیشہ ترقی پسندوں اور Leftist ارباب قلم کے ایک طرح سے مخالف رہے۔ چنانچہ لکھنؤ کے قلمکاروں نے (غالباً 2015 میں) جب عابد سہیل کی طویل مدتی ادبی خدمات کے اعتراف میں ان کے اعزاز میں ایک بڑے جلسے کا اہتمام کیا تو فاروقی صاحب اس میں شرکت کے لیے الہ آباد سے آئے اور جلسے کی صدارت بھی انہوں نے کی۔ جلسہ قیصر باغ میں جے شنکر پرساد آڈیٹوریم میں ہوا تھا اور آڈیٹوریم کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔

شرکاء میں ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، ڈاکٹر ولی الحق انصاری اور عمر انصاری بھی شامل تھے۔

فاروقی صاحب خاصی مدت تک لکھنؤ میں رہے۔ لکھنؤ میں اپنے قیام کے دوران وہ نیر مسعود سے بہت قریب ہوگئے۔ حالانکہ دونوں میں مختلف ادبی معاملات میں اختلافات بھی تھے۔ عطر کافور کے افسانوں پر منفی تبصرہ کرنے کے باوجود وہ نیر صاحب کی علمیت اور وسیع مطالعے کے معترف تھے۔ نیر صاحب کے علاوہ وہ عابد سہیل کو بھی خاصی اہمیت دیتے تھے۔ اگرچہ عابد سہیل ترقی پسند بلکہ Leftist تھے۔ جب کہ فاروقی ہمیشہ ترقی پسندوں اور Leftist ارباب قلم کے ایک طرح سے مخالف رہے۔

چنانچہ لکھنؤ کے قلمکاروں نے (غالباً 2015 میں) جب عابد سہیل کی طویل مدتی ادبی خدمات کے اعتراف میں ان کے اعزاز میں ایک بڑے جلسے کا اہتمام کیا تو فاروقی صاحب اس میں شرکت کے لیے الہ آباد سے آئے اور جلسے کی صدارت بھی انہوں نے کی۔ جلسہ قیصر باغ میں جے شنکر پرساد آڈیٹوریم میں ہوا تھا اور آڈیٹوریم کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ فاروقی صاحب نے اپنی تقریر میں عابد سہیل کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے یہ بھی کہا تھا کہ گذشتہ 40 برسوں میں انہوں نے ایسا جلسہ نہیں دیکھا۔

اسی طرح وہ نیر مسعود کے انتقال کے بعد ان کے چالیسویں کی مجلس میں شرکت کے لیے بھی الہ آباد سے آئے تھے۔ واضح ہو کہ نیر مسعود کے والد مسعود حسن رضوی ادیب کے چالیسویں کی مجلس (1975) میں بھی وہ شریک ہوئے تھے۔ نیر مسعود کے انتقال کے بعد شعیب نظام نے نیر صاحب کی علمی اور ادبی خدمات پر لکھنؤ میں جس بڑے سیمینار کا اہتمام کیا تھا۔ اس میں بھی فاروقی صاحب اپنی علالت کے باوجود الہ آباد سے آ کر شریک ہوئے تھے۔

❑❑❑

شمس الرحمٰن فاروقی کی افسانہ نگاری



ڈاکٹر رشید اشرف خان

شعبۂ اردو

ممبئی یونیورسٹی

مہاراشٹر

رابطہ: 7053562468

شمس الرحمن فاروقی نے اپنی اوائل زندگی میں ''گلستان'' کے نام سے ایک قلمی رسالے کی ترتیب شروع کی تھی جن میں زیادہ تر انھیں کے قلم سے لکھے ہوئے مضامین اور افسانے ہوتے تھے۔دسویں جماعت کا طالب علم بننے کے بعد انھوں نے گلستان بند کر دیا اور دیگر اخباروں اور رسالوں کے لیے مضامین اور افسانے لکھنے لگے۔ ۱۹۴۸ء یا ۱۹۴۹ء میں ان کا پہلا افسانہ چھپا تھا جس کا اب کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہے۔ گیارہویں جماعت میں پہنچتے پہنچتے فاروقی کا اٹھنا بیٹھنا جماعت اسلامی کے ادبی حلقوں میں ہو گیا۔ جماعت کے آرگن ''معیار'' میرٹھ میں ان کا طویل افسانہ یا ناولٹ ''دلدل کے باہر'' چار قسطوں میں چھپا تھا۔اس کے بعد انھوں نے سوویت روس میں مذہب پر استبداد کو دیکھتے ہوئے ایک افسانہ ''سرخ آندھی'' لکھا جس کو پڑھنے کے بعد ان کے اردو کے استاد شمس الآفاق شمس گورکھپوری نے کہا کہ تمھارے افسانے میں ایسی پختگی ہے جیسے بڑے افسانہ نگاروں کے یہاں ہوتی ہے۔اس افسانے کو بعد میں فاروقی کے محبوب استاد پروفیسر مہر و تر انے انگریزی میں ترجمہ کروا کر الہ آباد یونیورسٹی میگزین میں شائع کروایا۔

شمس الرحمن فاروقی کے تحریر کردہ پانچ طویل و مختصر افسانوں کا خوبصورت مجموعہ ''سوار اور دوسرے افسانے'' کے عنوان سے آج کی کتابیں نامی اشاعتی ادارہ نے کراچی پاکستان سے ۲۰۰۱ء میں شائع کیا تھا۔مجموعے میں شامل پانچوں افسانوں کی ترتیب یوں ہے:

۱۔ غالب افسانہ

۲۔ سوار

۳۔ان صحبتوں میں آخر

۴۔ آفتاب زمیں ۵۔لاہور کا ایک واقعہ

مذکورہ پانچوں افسانے کم و بیش اپنے اپنے موضوع کے اعتبار سے اچھے، نئے اور متاثر کن ہیں اور ہماری حقیقی زندگی سے بہت قریب ہیں۔

مرزا اسداللہ خاں غالب، مرزا مظہر جانِ جاناں، بدھ سنگھ قلندر، رائے کشن چند اخلاص، نواب قمرالدین خاں اعتمادالدولہ نصرت جنگ بہادر، مرزا عبدالقادر، سراج الدین خاں آرزو، میر تقی میر، شیخ غلام ہمدانی مصحفی، آتش اور اقبال وغیرہ سبھی ہمارے جانے مانے کردار ہیں۔ البتہ ان کے اردگرد کچھ غیر معروف اور گمنام کرداروں سے بھی کام لیا گیا ہے۔ ایک بات اور ہے وہ یہ کہ افسانے کا کوئی بندھا ٹکا موضوع نہیں ہوتا۔ دنیا اور انسانی زندگی سے متعلق کوئی بھی واقعہ، جذبہ، احساس، تجربہ اور مشاہدہ افسانے کا موضوع بن سکتا ہے جیسا کہ ہم نے فاروقی کے مذکورہ افسانوں کو پڑھتے وقت محسوس کیا مثلاً بینی مادھو رسوا کا غالب کے انتخاب کلام کے نسخوں پر خود ان کے دستخط لینا، یا مولوی خیرالدین کا شاعر نہ ہونے کے باوجود ایک مصرع کہہ دینا اور بعد میں اس مصرع کا حقیقت بن جانا۔ میر تقی میر کا نورالسعادۃ نامی خانہ بدوش سے عشق۔ مصحفی کی منکوحہ بھورا بیگم کے سوانحی حالات اور علامہ اقبال کی کوٹھی کے واقعات۔ یہ سب بیانات افسانوی ہوکر بھی موضوع افسانہ بن جانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر افسانے کا موضوع بڑی چابک دستی سے ماضی کو حال اور مستقبل میں بدلنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ شاید اسی لیے ''موضوع'' کو افسانے کی روح کہا جاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ افسانہ نویس یا فکشن نگار جب ہاتھ میں قلم لیتا ہے تو بڑی احتیاط کا مظاہرہ کرتا ہے۔ وہ اس راز سے بخوبی واقف ہوتا ہے کہ افسانے کا موضوع کردار، پلاٹ، زمان ومکاں، وحدت تاثر اور دیگر تمام فنی اجزا کے باعث ہی روشن ہو پاتا ہے اور یہ تمام فنی اجزا افسانہ کو آپس میں مربوط اور متاثر کرتے ہیں۔

صنف افسانہ میں موضوع کے انتخاب کے بعد جو چیز اہمیت رکھتی ہے وہ پلاٹ یعنی کہانی کا ڈھانچہ ہے جس میں کہانی کار اپنی سوجھ بوجھ اور مرضی کے مطابق رنگ بھرتا ہے۔ پلاٹ

مرزا اسداللہ خاں غالب، مرزا مظہر جانِ جاناں، بدھ سنگھ قلندر، رائے کشن چند اخلاص، نواب قمرالدین خاں اعتمادالدولہ نصرت جنگ بہادر، مرزا عبدالقادر، سراج الدین خاں آرزو، میر تقی میر، شیخ غلام ہمدانی مصحفی، آتش اور اقبال وغیرہ سبھی ہمارے جانے مانے کردار ہیں۔ البتہ ان کے اردگرد کچھ غیر معروف اور گمنام کرداروں سے بھی کام لیا گیا ہے۔ ایک بات اور ہے وہ یہ کہ افسانے کا کوئی بندھا ٹکا موضوع نہیں ہوتا۔ دنیا اور انسانی زندگی سے متعلق کوئی بھی واقعہ، جذبہ، احساس، تجربہ اور مشاہدہ افسانے کا موضوع بن سکتا ہے جیسا کہ ہم نے فاروقی کے مذکورہ افسانوں کو پڑھتے وقت محسوس کیا مثلاً بینی مادھو رسوا کا غالب کے انتخاب کلام کے نسخوں پر خود ان کے دستخط لینا، یا مولوی خیرالدین کا شاعر نہ ہونے کے باوجود ایک مصرع کہہ دینا اور بعد میں اس مصرع کا حقیقت بن جانا۔ میر تقی میر کا نورالسعادۃ نامی خانہ بدوش سے عشق۔

بجائے خود مکمل کہانی بننے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ دراصل افسانے کے موضوع یا Theme کی پھیلی ہوئی شکل کو پلاٹ کا نام دیا جاسکتا ہے۔ پلاٹ کو وجود میں لانے کا مقصد صرف یہ ہے کہ کسی واقعے کے بیان میں مصنوعی طریقوں پر کسی قدر چاشنی پیدا کی جاسکے۔ فن کے لیے مبالغہ ضروری امر ہے لہٰذا کسی معمولی واقعے کو قدرے پھیلا کر بیان کیے بغیر افسانہ، افسانہ نہیں بنتا بلکہ وہ محض واقعہ نگاری کے ذیل میں آتا ہے۔ بیانیہ میں کسی قدر کشمکش نہ پیدا کی جائے اور مکھی پر مکھی نہ بٹھا دی جائے تو افسانہ کامیاب افسانہ نہیں بن پاتا۔

مثال کے طور پر دیکھیے کہ بینی مادھو رسوا پہلی بار مرزا غالب سے ملاقات کے لیے گئے تو ان کی خدمت میں بطور نذر دو ریشمی لنگیاں اور دو ریشمی پگڑیاں پیش کیں۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ مرزا غالب اظہار تشکر کرتے اور چپ ہوجاتے لیکن انھوں نے فرمایا:

''بہت خوب، بہت خوب! مجھے عمامے میں سرخ رنگ بالکل پسند نہیں۔ اچھا ہوا کی ان عماموں میں کوئی بھی سرخ دھاگہ نہیں ہے۔ میں نے جھک کر تسلیم کی'' (۱)

پلاٹ کی مدد سے ہم واقعاتی افسانے بھی لکھ سکتے ہیں اس قول کی صداقت کا علم ہمیں ایک دینی مدرسہ کے سنجیدہ طالب علم مولوی خیرالدین اور ایک صوفی شاعر بدھ سنگھ قلندر کی پہلی ملاقات سے ہوسکتا ہے جو دہلی کے قدیم اردو بازار میں ہوئی تھی:

''ایک دوکان پر کھڑا وہ (قلندر) کوئی کتاب دیکھ رہا تھا۔ میں نے نزدیک جاکر دیکھا، غنی کاشمیری کے دیوان کا مطلا نسخہ تھا۔ اجنبی چابک سوار نے دیوان غنی کی منہ مانگی قیمت شاید ساڑھے آٹھ روپے دے دی اور رخصت ہونے کے لیے مڑا۔ میرا شناسا کتاب فروش اس کی طرف اشارہ کرکے بولا مولوی صاحب آپ انھیں نہیں جانتے اس نے کہا بندگی عرض کرتا ہوں خاکسار کو بدھ

سنگھ قلندرؔ کہتے ہیں۔'' (۲)

بعض افسانہ نگاروں میں شدت احساس کی فراوانی ہوتی ہے اور وہ اس شدت احساس کو اپنی خداداد لیاقت سے رنگینیِ تخیل اور بلند پروازی کے سانچے میں ڈھال سکتے ہیں اور کبھی کبھی افسانے میں پلاٹ کی کارفرمائی یوں بھی ہوتی ہے کہ افسانہ نگار ایک ذہنی خیال، انوکھے تصور یا شاعرانہ جذبے کو مادی شکل میں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ افسانے کا یہ اقتباس دیکھیے:

'' نورالسعادۃ نے اپنی نظریں میرؔ کے چہرے پر گاڑ دیں اور کہنے لگی '' مجھے رسوا ہونا ہے۔ میں تنہائی کی موت مروں گی۔ اور میری ماں ۔۔۔ میری ماں مجھ سے آزردہ رہیں گی۔ میرؔ نے کہا: ''تمھارے آسمان ناز پر رسوائی کے خفیف ترین بادل کا سایہ بھی نہ آنے پائے گا کہ میں تمھاری دنیا سے نکل جاؤں گا''۔ میرؔ نے بالآخر سنبھل سنبھل کر کہنا شروع کیا۔ ''اور تنہا تو تم کبھی ہو ہی نہیں سکتیں نور خانم! تم تو اپنے آپ میں خود مکمل ہو۔ تنہا نہ ہونے کے معنی یہ نہیں کہ عاشقوں کا ہجوم ہو۔ تنہا نہ ہونے کے معنی ہیں نفس مطمئنہ حاصل ہونا۔ اور وہ تمھیں شروع سے حاصل ہے اور ہمیشہ رہے گا۔'' (۳)

فکشن کے ناقدین نے ایک اچھے پلاٹ کی پانچ خصوصیات بیان کی ہیں:

۱۔ سادگی، ۲۔ تھوڑا بہت تصنع، ۳۔ واقعات میں جدت، ۴۔ منتہا کی تیزی، ۵۔ دلچسپی۔ جب کسی افسانے میں نہایت ہنرمندی کے ساتھ مذکورہ خصوصیات کا لحاظ رکھا جاتا ہے اور انھیں بخوبی برتا جاتا ہے تو وحدت تاثر کی کیفیت پیدا ہوتی ہے جو بہر حال افسانے کی کامیابی کی ضامن ہوتی ہے۔

فاروقی کے تخلیق کردہ سبھی افسانوں میں شعوری اور لاشعوری طور پر پلاٹ اور اس کی پانچوں خصوصیات کا التزام ملتا ہے۔ مثلاً غالب افسانہ کا راوی، بینی مادھو سنگھ رسواؔ پہلے اپنا تعارف پیش کرتا ہے پھر اپنی تعلیم و تربیت اور زبان فارسی و ریختہ سے گہرے لگاؤ کی باتیں کرتا ہے۔ پھر اپنی شاعری اور گھر کی بربادی کا دکھ بھرا افسانہ سنا کر کانپور ہوتے ہوئے دہلی جانے کا ذکر کرتا ہے تب کہیں غالب سے تعارف کی نوبت آتی ہے۔

فاروقی کے تخلیق کردہ سبھی افسانوں میں شعوری اور لاشعوری طور پر پلاٹ اور اس کی پانچوں خصوصیات کا التزام ملتا ہے۔ مثلاً غالب افسانہ کا راوی، بینی مادھو سنگھ رسواؔ پہلے اپنا تعارف پیش کرتا ہے پھر اپنی تعلیم و تربیت اور زبان فارسی و ریختہ سے گہرے لگاؤ کی باتیں کرتا ہے۔ پھر اپنی شاعری اور گھر کی بربادی کا دکھ بھرا افسانہ سنا کر کانپور ہوتے ہوئے دہلی جانے کا ذکر کرتا ہے تب کہیں غالب سے تعارف کی نوبت آتی ہے۔

واقعات میں جدت جو ایک اچھے پلاٹ کا بنیادی جز و اعظم ہے جو فاروقی کے افسانوں میں بے انتہا پائی جاتی ہے۔ مثلاً ان کے افسانہ سوار میں جب مولوی خیرالدین ایک ہفتہ اپنے مدرسہ میں پڑھنے کے بعد گھر واپس آتے ہیں تو ان کی چھوٹی بہن ستی بیگم یہ خوش خبری سناتی ہے کل ایک خنگ سوار دہلی کی مختلف سڑکوں سے گزریں گے۔ ان میں اتنی روحانیت ہے کہ جو کچھ مانگو وہ دے دیتے ہیں۔ خیرالدین پہلے تو بہن کی ضعیف الاعتقادی کا مذاق اڑاتے ہیں لیکن دوسرے دن خود بھی بہ صد اشتیاق استاد خیراللہ مہندس کی حویلی پہنچ گئے تو دیکھا:

'' دفعتاً ترکمان دروازے کی طرف سے ہلکا سا، عجیب سا شور اٹھا اور پھر خاموشی۔ میرے پاس کھڑے کچھ لوگوں نے زیر لب درود شریف پڑھنا شروع کر دیا۔ وہ مدھم سا شور پھر اٹھا اور اس بار کچھ دیر تک رہا۔ بعض لوگ گردن بڑھا بڑھا کر ترکمان دروازے والے راستے کو دیکھنے کی کوشش کرتے ۔۔۔ یہ شور کیسا تھا؟ کیا سب لوگ وہاں پر بلند آوازوں میں درود یا کوئی دعا پڑھ رہے تھے؟ کوئی نمودار ہوا بھی تھا کہ نہیں؟ (۴)

فن افسانہ نگاری میں پلاٹ کا ایک لازمی جز ولاینفک اس کا اختتامیہ، منتہا یا (Climax) بھی ہوتا ہے۔ قاری کی دلچسپی اور تجسس کو قائم رکھنے کے لیے، افسانہ نگار ایک ایسا پلاٹ مرتب کرتا ہے کہ کہانی میں آغاز بھی ہو اور سوچا سمجھا انجام بھی۔ لیکن ضروری نہیں کہ ہر افسانے میں پلاٹ کے سبھی اجزائے ترکیبی منظم اور بالترتیب ہی ہوں۔ کچھ پلاٹ ایسے بھی ہماری نگاہوں

سے گزرتے ہیں جن کے واقعات منفرد ہوتے ہوئے بھی قصے کو بااثر اور مکمل منتہا تک پہنچنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ایسی مثالیں ہمیں اکثر طویل کہانیوں میں مل جاتی ہیں۔

''ان صحبتوں میں آخر'' فاروقی کا لکھا ہوا ایک ایسا ہی طویل افسانہ ہے جس میں ایک سے زیادہ مرکزی کردار ہیں۔سب سے پہلے لبیبہ خانم اور اس کی مالکن رقاصہ زہرہ مصری، پھر لبیبہ خانم اور اس کا شوہر بایزید شوقی، پھر لبیبہ خانم اور اس کی اکلوتی بیٹی نور السعادۃ، پھر اعتماد الدولہ نواب قمرالدین خاں بہادر نصرت جنگ وزیرالملک شہنشاہ ہند اور لبیبہ خانم اور پھر اعتمادالدولہ کے ایلچی رائے کشن چند اخلاص۔ان سب کے وجود نے اپنے اپنے کردار کو انفرادی طور پر نباہا اور قصہ کے ارتقا میں حصہ لیا لیکن آخر آخر میں ہمیں خدائے سخن میر تقی میرؔ، نورالسعادۃ عرف نور خانم سے بے پناہ عشق کرتے نظر آتے ہیں۔قصے کی دلچسپی میں جہاں ایک طرف چبھتے ہوئے مکالمے ہیں وہیں فارسی اور اردو کے برجستہ اشعار بھی ہیں۔خصوصیت کے ساتھ میرؔ کے اشعار اور مثنویوں کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ سبھی اشعار واقعاتی ہیں اور نور خانم کو مخاطب کرنے کے لیے ہیں۔غور کیجیے تو یہ میرؔ کے اشعار کی نئی اور بالکل نرالی توجیہ وتشریح ہے۔

بہرنوع ''ان صحبتوں میں آخر'' کا منتہا یوں ہے کہ لبیبہ خانم نے بغیر نائکہ زہرہ مصری کو مطلع کیے اس کا گھر چھوڑ دیا۔بایزید شوقی نے لبیبہ خانم سے شادی کی جس سے نورالسعادۃ کی ولادت ہوئی۔بایزید شوقی کے انتقال کے بعد لبیبہ خانم اور نورالسعادۃ، اخلاصؔ کی معیت میں دہلی پہنچ گئیں۔اب ان کے نام خانم بزرگ اور نور خانم ہوگئے، رقص وسرود ان کا پیشہ ہوگیا۔اعتمادالدولہ نے دونوں کو اپنے یہاں ملازم رکھنے کے بعد آزاد کردیا۔اخلاص لبیبہ خانم کے عاشق بن گئے۔میر تقی میرؔ اخلاصؔ کے بے تکلف دوست تھے وہ نو رالسعادۃ پر مرمٹے۔ماں بیٹی، دلی چھوڑ کر ایران واپس چلی گئیں۔راستے میں بیمار ہوکر نورالسعادۃ کا انتقال ہوگیا اور لبیبہ خانم لاپتہ ہوگئی۔

اس طرح افسانہ اپنے منتہا تک پہنچتا ہے۔قاری از اول تا آخر کہانی کی طرف متوجہ رہتا ہے اور قصہ کے اتار چڑھاؤ سے متاثر ہوتا ہے۔میرے خیال میں یہی مصنف کا مقصد تھا جو آخر کار حاصل ہوکر رہا۔

افسانہ لکھتے وقت اس کی مناسب سرخی قائم کرنا بھی افسانہ نگار کا ایک اہم فریضہ ہے۔سرخی کو ایک قسم کا اشتہار سمجھنا چاہئے جو قاری کو افسانہ خوانی پر مائل کرتا ہے۔یہ اشتہار عموماً پڑھنے والے کی توقعات پر پورا اترتا ہے لیکن اکثر نہیں بھی اترتا۔دراصل سرخی کو افسانے کی روح یا اس کے مرکزی خیال اور مقصد کی طرف اشارہ کرنے والا ہونا چاہئے۔سرخی ایسی دوراز کار بھی نہ ہو جس کو قاری نے کبھی نہ سنا ہو نہ پڑھا ہو۔افسانے کی سرخی ایسی ہونی چاہیے کہ قاری کو سوچنے پر بھی مجبور کردے۔اچھی سرخی کا کمال یہ ہے کہ جب ہم افسانے کو ختم کریں تو محسوس ہو کہ موجودہ سرخی بڑی حد تک افسانے کے لیے موزوں ترین سرخی ہے۔

مثال کے طور پر جب ہم شمس الرحمن فاروقی کے تخلیق کردہ افسانوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان افسانوں کی سرخی کے تعلق سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان کے یہاں سرخیوں کا نظام عام روش سے مختلف ہے جیسے ان کے افسانوی مجموعے کا پہلا افسانہ ''غالب افسانہ'' ایک ایسا افسانہ ہے جسے ہم آسانی سے ''راز آشکار'' (Open Secret) کہہ سکتے ہیں۔افسانے کی سرخی بذات خود آواز دیتی ہے کہ میرا بیانیہ تمام تر مرزا اسداللہ خاں غالب کی زندگی کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔یہ اور بات کہ فاروقی نے اپنے مطالعہ، فنی تجزیے اور زبان وبیان سے کام لیتے ہوئے واقعات میں رنگ آمیزی کی ہے اور حقیقت کو افسانہ بنادیا ہے۔

مجموعے کا دوسرا افسانہ ''سوار'' اگرچہ بنیادی اہمیت کا حامل اور مصنف کا شاید سب سے زیادہ پسندیدہ افسانہ ہے لیکن اس کی سرخی اور افسانے کے متن میں بظاہر کچھ زیادہ تال میل نظر نہیں آتا۔بہت ممکن ہے کہ یہ میرے شعور قرأت ومعاملہ فہمی کی نارسائی ہو۔سوار کی کہانی قدیم دلّی کے ایک دینی مکتب سے شروع ہوتی ہے جہاں قران وحدیث، تفسیر ومنطق اور علم کلام کے علاوہ طب یونانی کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔یہ ایک اقامتی ادارہ ہے۔جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ اس مکتب کے ایک طالب علم مولوی خیرالدین ہفتے کی چھٹی پر اپنے گھر پہنچے، جہاں ان کی چھوٹی بہن ستی بیگم اور والدہ ان کی آمد کی منتظر تھیں۔ستی بیگم نے اپنے بھائی کو یہ خوش خبری دی کہ کل ادھر سے ایک نقاب پوش (خنگ سوار) گزریں گے۔ان میں اتنی روحانیت ہے کہ ان کا راستہ روک کر جو بھی اپنا مدعا بیان کرے، وہ عطا کرتے ہیں۔خیرالدین نے بہن کی باتوں پر توجہ نہیں کی البتہ دوسرے دن بہن کی ضد پر نقاب پوش سوار کی زیارت ضرور کی۔

اس تذکرہ کے بعد سوار کا کہیں حوالہ ہی نہیں ملتا بلکہ صوفی شاعر بدھ سنگھ قلندر اور اس کے پیر و مرشد مظہر جانِ جاناں کی تفصیلات ملتی ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر ان دو کہانیوں کو ملا کر فاروقی نے افسانے کا عنوان ''سوار'' کیوں قرار دیا۔؟ ممکن ہے کہ وہ قارئین کو حیرت و استعجاب (Suspence) میں مبتلا کر کے ان کی آتش اشتیاق کو بڑھانا چاہتے ہوں لیکن بہر حال اس سرخی کو ہم اچھی سرخی نہیں مان سکتے۔

مجموعے کے تیسرے افسانے کی سرخی ''ان صحبتوں میں آخر'' بڑی معنی خیز اور افسانے کے متن سے بڑی حد تک مطابقت رکھتی نظر آتی ہے۔ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ اس کا عنوان میر تقی میرؔ کے حسب ذیل شعر سے ماخوذ ہے جو ان کے دیوان اول میں موجود ہے:

ان صحبتوں میں آخر، جانیں ہی جاتیاں ہیں
نَے عشق کو ہے صرفہ ، نَے حسن کو محابا

اس افسانے کا منتہا میر تقی میرؔ اور نور خانم کا عشق ہے۔ اس لحاظ سے اس کی سرخی کا میرؔ کے شعر سے اخذ کیا جانا اپنے طور پر بے حد مناسب اور دلچسپ ہے۔ شرط یہ ہے کہ افسانے کو از اول تا آخر پوری دلچسپی اور یکسوئی سے پڑھا جائے۔ فاروقی کے افسانے محض لطف بیان اور وقت گزاری کے لیے نہیں پڑھے جاتے۔ یہ ایک اٹل حقیقت ہے۔

چوتھے افسانے کی سرخی ''آفتاب زمیں'' کی بنیاد بھی اردو کے دور قدیم کے شاعر استاد شیخ غلام ہمدانی مصحفی امروہوی کے شعر کی یاد لاتی ہے جو ان کے دیوانِ نہم میں ہے:

آفتاب زمیں ہوں میں ، لیکن
مجھ سے روشن ہے ، آسمان سخن

اس افسانے کی حیثیت بڑی حد تک سوانحی ہے البتہ یہ افسانہ بیک وقت تین راویوں کی زبانی بیان کیا گیا ہے یعنی لالہ کانجی مل صبّا کا لائق فرزند درباری مل وفاؔ مصحفی کی بیوہ حیات النسا اور خود حضرت مصحفی۔ استاد مصحفی کا رول یہ تھا کہ موقع بہ موقع اشعار سناتے تھے جن کی مدد سے کہانی دلچسپ ہوگئی اور مربوط بھی۔ گویا افسانہ اور اس کی سرخی ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم قرار پائے۔

رہ گیا پانچواں افسانہ ''لاہور کا ایک واقعہ'' اگرچہ یہ مختصر ہے اور مصنف کے ایک خواب پریشاں پر مبنی ہے لیکن خیالی باتوں کے باوجود فکشن کا ایک کامیاب نمونہ ہے۔ سرخی پر نظر پڑتے ہی قاری پر جیسے جادو سا ہو جاتا ہے۔ ہر جملے کے بعد پھر سوچتا ہے کہ کیا ہوا ؟ اور یہی تحرک، افسانہ نگار کی کامیابی کی ضمانت بن جاتا ہے۔ اس مختصر سے افسانے میں فنی وحدتوں کی عدم موجودگی کے باوجود کہانی پن ختم نہیں ہوتا۔

کردار نگاری کا افسانے کی کامیابی میں بڑا ہاتھ ہے اگرچہ بعض افسانے بغیر کرداروں کے لکھے گئے ہیں لیکن کرداروں کی اہمیت کو سبھی مستند ناقدین نے مانا ہے:

'' مختصر افسانے میں پلاٹ سے زیادہ کردار کی اہمیت ہے۔ کردار جو حقیقی اور زندہ ہوتے ہیں وہ پڑھنے والے کے حافظے میں داخل ہو کر وہیں ٹھہر جاتے ہیں۔''(۵)

دراصل کردار نگاری کا عمل ڈرامہ نگاری کا بھی ایک لازمی جز ہے اسی لیے کرداروں کے عمل اور مکالمے کی مدد سے افسانوں کو زیادہ با اثر اور نتیجہ خیز بنایا جا سکتا ہے۔ یہ کہنا صریحاً غلط ہے کہ افسانے میں کردار کی حیثیت ثانوی ہے اور وہ محض کسی وقوعہ کے وجود میں آنے کا سبب بنتا ہے۔ فاروقی کے افسانوں پر عمیق نظر ڈالیے تو آپ کو بخوبی اندازہ ہوگا کہ ان میں مرکزی اور ثانوی ہر قسم کے کردار پائے جاتے ہیں لیکن ان میں ایک بھی کردار ایسا نہیں جسے قصہ سے باہر نکالا جائے یا اس کی شکل تبدیل کی جا سکے۔

مثال کے طور پر اگر بینی مادھو سنگھ رسواؔ کا کردار نہ ہوتا تو غالب افسانہ کی کہانی ہمیں کون سناتا۔ رسواؔ صرف ایک خاندانی راجپوت ہی نہیں بلکہ وہ ایک ہوش مند، مستقل مزاج اور مہذب نوجوان ہے۔ اس نے اپنی مہذب اور عاقلانہ گفتگو سے مرزا غالب کا دل جیت لیا۔ ان کے شغل مے نوشی اور حقہ کشی میں بھی شریک ہوا اور باتوں باتوں میں فن شعر گوئی ، فارسی دانی اور غالب کے ذاتی واقعات بھی سن لیے۔ اسی طرح افسانہ ''سوار'' کے سبھی کردار اپنی الگ الگ شان رکھتے ہیں۔ ''ان صحبتوں میں آخر'' ایک ایسا افسانہ ہے جس میں شاندار کرداروں کی گویا ایک کہکشاں ہے جس میں ہر کردار ایک مرکزی حیثیت کا حامل ہے۔ افسانہ ''آفتاب زمیں'' جس کا محور استاد الشعرا شیخ غلام ہمدانی مصحفی کی ذات ہے۔ حد تو یہ ہے کہ فاروقی کے آخری افسانہ ''لاہور کا ایک واقعہ'' محض واحد متکلم کے گرد گھومنے کے باوجود کئی گمنام کرداروں کا مرقع بھی ہے جن میں ہر ایک رنگ و بو ایک دوسرے سے جدا گانہ ہے مگر ''انتشار میں اتحاد'' کی ایک بہترین اور نایاب مثال ہے۔ اس میں سبھی نمایاں اور مجہول کردار موٹر کار، ریوالور ، پیشاب خانہ ، تانگہ ، ریلوے اسٹیشن اور ایک بے تکلف دوست سبھی کردار سپاٹ اور گول ہوتے ہوئے بھی قابل توجہ ہیں۔

فاروقی کی افسانہ نگاری کی ایک اور قابل ذکر اور لائق تعریف خصوصیت ان کی تاریخ دانی ہے جس کا مظاہرہ قریب قریب ان کے ہر افسانے میں ملتا ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ سرسری تاریخی شعور بہت زیادہ دور تک انسان کے کام نہیں آسکتا اس میں قدم قدم پر بڑے نازک مقام آتے ہیں اور یہ خطرہ رہتا ہے کہ کوئی ہم پر بے جا الزام تراشی، مبالغہ آرائی، تعصب، جانب داری اور کذب و افترا کی تہمت نہ لگا دے۔ فاروقی کے افسانے بڑی حد تک ان غلطیوں سے پاک ہیں۔

کہانی بہر حال کہانی ہے اگر خدانا خواستہ اس میں سب کچھ ہو اور ''قصہ پن'' نہ ہو تو اسے کوئی بھلا کیوں پڑھے یا سنے؟ غور کیجیے تو ہمارا قدیم داستانی ادب تو کم وبیش طول طویل باتوں، محیر العقول قصوں اور دیو پری، جادو ٹونے، ہیرو پرستی سے بھرا پڑا ہے۔ یہاں تک کہ نام نہاد ''تاریخی ناول'' کا لیبل لگے ہوئے قصے بھی ''ایجاد بندہ'' کے الزام سے یکسر نہیں بچ سکے۔ ایسی کہانیوں کا مقصد اصلاح معاشرہ بھی ہوسکتا ہے، درس اخلاق بھی اور تبلیغ عقیدہ بھی لیکن ہر صورت میں افسانے کی چاشنی لازمی ہوتی ہے۔

فاروقی کے افسانوں میں جو تاریخی حوالے یا اشارے ملتے ہیں وہ کافی صحت مند اور قرینِ قیاس کہے جاسکتے ہیں۔ مثلاً ''غالب افسانہ'' میں مرزا غالب کا کردار قریب قریب وہی ہے جو ان کے تذکرہ نگاروں، سوانح نویسوں ان کے خطوط اور اشعار میں بکھرا پڑا ہے۔ لہٰذا ان تمام مواد سے کام لیتے ہوئے فاروقی نے ایک تاریخی افسانہ نہایت کامیابی سے تحریر کر دیا۔ اس میں ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ محتاط محقق، ادیب و غالب شناس مالک رام نے واحد متکلم بن کر افسانۂ غالب بیان کیا جب کہ فاروقی نے ایک کردار بینی مادھو سنگھ رسوا کی زبان سے پوری کہانی سنائی جو یقیناً ان کا قابل

فاروقی کی افسانہ نگاری کی ایک اور قابل ذکر اور لائق تعریف خصوصیت ان کی تاریخ دانی ہے جس کا مظاہرہ قریب قریب ان کے ہر افسانے میں ملتا ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ سرسری تاریخی شعور بہت زیادہ دور تک انسان کے کام نہیں آسکتا اس میں قدم قدم پر بڑے نازک مقام آتے ہیں اور یہ خطرہ رہتا ہے کہ کوئی ہم پر بے جا الزام تراشی، مبالغہ آرائی، تعصب، جانب داری اور کذب و افترا کی تہمت نہ لگا دے۔ فاروقی کے افسانے بڑی حد تک ان غلطیوں سے پاک ہیں۔ کہانی بہر حال کہانی ہے اگر خدانا خواستہ اس میں سب کچھ ہو اور ''قصہ پن'' نہ ہو تو اسے کوئی بھلا کیوں پڑھے یا سنے؟ غور کیجیے تو ہمارا قدیم داستانی ادب تو کم وبیش طول طویل باتوں، محیر العقول قصوں اور دیو پری، جادو ٹونے، ہیرو پرستی سے بھرا پڑا ہے۔ یہاں تک کہ نام نہاد ''تاریخی ناول'' کا لیبل لگے ہوئے قصے بھی ''ایجاد بندہ'' کے الزام سے یکسر نہیں بچ سکے۔

تحسین اقدام ہے۔

دراصل فاروقی کی افسانہ نگاری کے حوالے سے اس مختصر سے جائزے کا جواز یہ ہے کہ فکشن نگاری کے ضمن میں ان کے تخلیقی رویوں کا کچھ اندازہ لگایا جاسکے۔ انھوں نے مذکورہ بالا افسانوں میں واقعات کو ادبی تاریخ کے تناظر میں پیش کیا ہے۔ اس ضمن میں اُن کی مشہور تحقیقی کتاب ''اردو کا ابتدائی زمانہ، ادبی تہذیب وتاریخ کے پہلو'' کا ذکر بھی دلچسپی کا حامل ہے۔ غالباً اس نوع کے فکشن لکھنے کی ترغیب فاروقی کو اسی کتاب کے تحقیق کے دوران ملی ہوگی۔ سوار کو چھوڑ کر باقی تمام افسانے اردو کے نامور شعرا کی حیات سے کسی نہ کسی طور متعلق ہیں بلکہ سوار میں بھی اردو کی ادبی تاریخ کی کئی نامور شخصیات سے ملاقات ہوتی ہے۔

فکشن کے حوالے سے شمس الرحمن فاروقی کا شہرۂ آفاق ناول ''کئی چاند تھے سر آسماں'' بھی اردو زبان و ادب کے معروف شاعر داغ دہلوی کی والدہ وزیر خانم کی زندگی پر مبنی ہے۔ گو کہ ناول میں مرکزی کردار مخصوص اللہ، وزیر خانم، مارسٹن بلیک، ولیم فریزر، شمس الدین احمد خاں اور آغا مرزا تراب علی رفاعیؔ اہم ہیں لیکن ضمنی طور پر اردو زبان و ادب کی کئی ممتاز شخصیات ناول کا حصہ بنتی ہیں۔ اس ناول کا متن بھی مذکورہ بالا افسانوں کے متون کی طرح ادبی تاریخ کے حوالے سے قائم کیا گیا ہے تاہم ایسا نہیں ہے کہ ناول مذکورہ افسانوں کی محض توسیع ہے۔ فاروقی نے اس ناول کو بالکل ہی الگ شان سے لکھا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ غالب افسانہ ص ۴۶
۲۔ افسانہ سوار ص ۸۴۔
۳۔ افسانہ ان صحبتوں میں آخر ص ۱۹۵
۴۔ افسانہ سوار ص ۷۶
۵۔ پروفیسر سید احتشام حسین: تنقید اور عملی تنقید، ص ۵۴

❑❑❑

شمس الرحمٰن فاروقی پر ایک نوٹ



ذاکر حسین ذاکر

شانتی نگر وارڈ، وارڈ نمبر ۷

نزد سنت پشپا اسکول

دیوریا

رابطہ: 9415276138

شمس الرحمن فاروقی جیسے نابغہ صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔انہیں ہم اکیسویں صدی کے نابغہ کے طور پر یاد کر سکتے ہیں۔ہم نہیں ہونگے مگر آنے والی نسلیں فاروقی کو مرزا غالب کی طرح یاد کریں گی۔طالب علمی کے زمانے میں فاروقی کی شخصیت سے مجھے دو لوگوں نے متعارف کرایا، اور ان دونوں کا بیانیہ مختلف تھا۔اول گورکھپور یونی ورسیٹی کے اسسٹنٹ لائبریرین مصطفی کمال جو فاروقی کے بچپن کے دوست تھے۔ان دونوں نے ابتدائی زمانے میں جماعت اسلامی کے ہمدرد کی حیثیت سے کام کیا تھا۔مصطفی کمال تو آخر تک جماعت اسلامی سے منسلک رہے۔مگر فاروقی نے اپنی کشتی کے بادبان کو نئے ساحلوں سے متعارف کرایا۔ان کی زندگی بہت جلد ادبی طوفانوں پر وار کرنے اور سیلابوں سے ٹکر لینے میں مصروف ہوگئی۔

مصطفی کمال شب خون کے مسلسل قاری تھے اور فاروقی کی تخلیقات کو دل سے سراہتے تھے۔اس کے برخلاف دوسرے شخص میرے استاد ڈاکٹر اختر بستوی تھے، جو فاروقی پر سیدھا وار کرتے تھے۔وہ شب خون کو ادبی خون کہتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ فاروقی جدیدیت کے نام پر لایعنی ادب کی تخلیق کے لئے آئی ایس آئی سے فنڈ لیتے ہیں۔آج مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک زمانہ تھا جب لوگ اپنے مخالفین کو متشدد کرنے کے لئے آئی ایس آئی کا نام لیتے تھے۔لیکن چار سالوں بعد غالباً 92 میں ایک دن میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر اختر بستوی کی میز پر 'شعر شور انگیز' کی چاروں جلدیں بہت اہتمام سے رکھی ہوئی ہیں۔اس دن صبح ڈاکٹر اختر بستوی کے حواس پر فاروقی چھائے ہوئے تھے۔وہ فاروقی کو ایک نئے زاویے سے دیکھ رہے تھے، جس کا محور شعر شور انگیز تھا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی پھٹ پڑے۔میرے کام کی نوعیت سے اکثر وہ مجھ پر غصہ اتارتے تھے۔مگر اس دن کچھ بات الگ تھی۔وہ شعر شور انگیز کی تعریف میں رطب اللسان تھے اور متواتر ایک گھنٹے تک اس کی خوبیوں کے متعلق اظہار خیال کرتے رہے۔ مجھے تو ان کی باتیں خاک سمجھ میں آئیں مگر اتنا یاد ہے کہ وہ کہہ رہے تھے کہ یہ کتاب اردو کے لئے بالکل نئی چیز ہے اور اردو کو نئی سمت و رفتار سے نوازے گی۔

ان سب کے درمیان پروفیسر محمود الٰہی بہت منکسر المزاج تھے۔میں نے پہلی بار فاروقی کو گورکھپور یونی ورسیٹی 4 پروفیسر کالونی واقع محمود الٰہی صاحب کے گھر ان کی بیٹی کی شادی تقریب کے دوران دیکھا۔میں نے دیکھا کہ گہرے گھنگھرالے بالوں والے فاروقی کے چہرے پر گھنی مونچھے تھیں اور چمک دار پیشانی والے خوبصورت چہرے کو موٹے شیشے کا فریم احاطہ کئے ہوئے ہے۔وہ سوٹ بوٹ میں ملبوس چھیلا نظر آرہے تھے۔

صبح 10 بج رہا ہوگا جیسے ہی فاروقی صاحب گھر کے برامدے میں پہنچے۔ الٰہی صاحب تقریباً دوڑتے ہوئے اندر سے برامد ہوئے اور فاروقی سے پرتپاک انداز میں گلے ملے۔ یہ دو طوفانی موجوں کے ملنے جیسا عمل تھا۔اس دوران دونوں قد آور شخصیات کے اطراف آدھا درجن ریسرچ اسکالر کھڑے ہوگئے تھے، جو شادی کی تیاریوں کے سلسلے میں کئی دنوں سے ڈٹے ہوئے تھے۔میں بھی ان میں سے ایک تھا۔

گزشتہ 25 برسوں میں بہت کچھ بدل گیا۔فاروقی کو سرسوتی سمان ملا۔شب خون بند ہو گیا اور نئے ادبی دھماکے طور پر ان کا ناول کئی چاند تھے سر آسماں اردو کے افق پر چھا گیا۔یہ ناول کالی گھٹاؤں کی طرح سر زمین اردو پر برسا اور افسانوی ادب کو شرابور کر دیا۔تعجب ہوتا ہے کہ ایک آدمی پہلا ناول لکھتا ہے اور وہ سنگ میل ہو جاتا ہے۔

اس ناول پر بہت کچھ لکھا گیا، بہت کچھ لکھا جا رہا ہے اور بہت کچھ لکھا جائے گا۔باوجود اس کے ان کے کارنامے کو احاطہ کرنا مشکل ہوگا۔یہ ناول میرے ذہن میں آگ کا دریا کے جادو کو بے اثر کر دیا۔میرے حواس پر چمپا بازی کی جگہ وزیر خانم نے جگہ بنا لیا۔اس ناول پر فاروقی کو نوبل انعام ملنا چاہئے۔میرا ایک مضمون روزنامہ راشٹریہ سہارا کے امنگ میں شائع ہوا۔انہوں نے ڈاکٹر افغان اللہ خاں سے مزاحیہ لہجے میں کہا کہ یار کوئی آدمی ہے جو مجھے نوبل انعام دئے جانے کا مطالبہ کر رہا ہے۔

پروفیسر افغان اللہ خاں نے میرے بارے میں بتایا۔انہوں نے مجھ سے بھی کہا کہ فاروقی صاحب تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ ان دنوں تو نہیں لیکن 2012 میں فاروقی سے میں ان کے گھر پر ملا۔میں نے ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔کہنے لگے یار میں صوفی تھوڑے ہوں۔میں نے کہا حضور آپ ادب کے صوفی ہیں۔یہ دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی کہ وہ کتنی پیاری بھوجپوری بول رہے تھے۔شاید الہ آباد میں چالیس برسوں سے مسلسل رہنے کا نتیجہ تھا۔انہوں نے دیر سے آنے والے اپنے مالی کو بھوجپوری میں ڈانٹ پلائی۔

مجھے اندازہ ہوا کہ جب کوئی اعلیٰ درجے کا انگریزی داں اور ماہر اردو ہو تو وہ کتنا خوبصورت بھوجپوری بول سکتا ہے۔پروفیسر محمود شیرانی کو بھوجپوری سے سخت نفرت تھی مگر یہ کیا کہا جائے کہ مجھے پنجابی سے اتنی ہی نفرت ہے۔

فاروقی کس قدر ذہین تھے، اس کا اندازہ ان کا مقالہ 'اردو کا ابتدائی زمانہ' پڑھنے کے بعد لگایا جا سکتا ہے۔فاروقی جس نتیجے پر 20 برس قبل پہنچ چکے تھے، وہاں پہنچنے کے لئے محققین کو مزید کام کرنا پڑے گا۔ان کے مقالے افسانے کی حمایت میں فکشن کا ساتواں دروازہ کھولنے میں کامیاب ہوئے۔

نئے افسانے لکھنے والوں کے لئے اس میں کئی در ہیں جو افسانے کی عمارت میں داخل ہونے کے لئے افسانہ نگار کو راغب کرتے ہیں۔وہ تمام زندگی نئے ادبی محاذ پر کھڑے رہے اور نئے ادبی رجحانات کی بنیادیں رکھتے رہے۔وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے، اس میں سے ایسے ایسے ہیرے موتی نکالتے کہ پڑھنے والا دنگ رہ جاتا ہے۔

فکشن، تنقید، تراجم، صحافت، عروض و بلاغت اور شاعری جیسے موضوعات پر تقریباً 50 سے زاید کتابوں کے مصنف فاروقی 30 ستمبر 1935 میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم گورکھپور میں حاصل کی جہاں ان کا خاندان اعظم گڑھ سے نقل مکانی کر کے آباد ہو چکا تھا۔

ان کی تعلیم الہ آباد میں مکمل ہوئی۔انہوں نے ہیسٹنگز روڈ پر اپنا شاندار آشیانہ بنایا۔دال منڈی میں شادی کی۔بلیا، اعظم گڑھ، لکھنؤ، نئی دہلی اور پٹنہ میں نوکریاں کیں اور ہنگامہ خیز ادبی زندگی گزارنے کے بعد وہ 25 دسمبر 2021 کو اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔

ہمیں اس بات پر خوش ہونا چاہئے کہ ان کی وراثت ان کی بیٹی مہر افشاں فاروقی سنبھالیں گی جو خود بھی بہت قابل ذکر مصنفہ اور نقاد ہیں۔ ابھی حال میں ان کی کتاب 'غالب: اے وائلڈر نیس ایٹ مائی ڈور اسٹیپ' شائع ہوئی ہے۔ 2013 میں انہوں نے 'موڈرن اردو لٹریچر' لکھ کر کافی شہرت کمائی ہے۔

❑❑❑

ڈاکٹر رؤف خیر
رابطہ: 9440945645

قطعۂ تاریخ وفات

(۲۵؍دسمبر ۲۰۲۰ء)

شمس رحمن عرف فاروقی
تھے جو شب خون کے سپہ سالار

ہاتھ میں لے کے ذوالفقارِ قلم
سومناتِ ادب پہ کی یلغار

دہریوں کو نکالا قلعوں سے
کردیے ان کے حوصلے مسمار

زعفرانی تھا گیانؔ یرقانی
اس سے دنیا کو کردیا ہشیار

میرؔ و غالبؔ کے شعر۔ شور انگیز
اور باقیؔ کے شعر بے معیار

چاند چہرہ وزیر خانم کا
تھا سرِ آسمان رونق بار

نثر کا امتیاز سمجھایا
شعر اور غیر شعر کا معیار

درس دیتے رہے بلاغت کا
لکھ کے بوطیقہ، جدید آثار

آپ کے تبصرے بھی تھے بھرپور
اور تنقید نو بھی خوش اقدار

رد کیا جوشؔ ملسیانی کا
بن کے اقبال کا سپہ سالار

دشمنوں کی خبر وہ لیتے تھے
تھا ''خبر نامہ'' ان کا اک ہتھیار

تھے وہ علمِ عروض کے ماہر
تھے زبان و بیاں کے شاہ سوار

بے گماں دشمنوں کے دشمن تھے
جاں نثاروں کے اور یاروں کے یار

ناصرؔ کاظمی کبھی مشتاقؔ
ان کی نظروں میں تھے فراقؔ سے پار

بڑھ کے غالبؔ سے ہے ظفرؔ اقبال
کبھی ایسا بھی کردیا اظہار

لے لیا یہ بیان پھر واپس
اور ان اسناد کو کیا بے کار

وہ بدلتے رہے ہیں ترجیحات
اپنے الفاظ پر نہ تھا اصرار

خود میں اک انجمن تھے فاروقی
زیبؔ سر کرکے علم کی دستار

قلعہ شعر و ادب کا تاریخی
اس دسمبر میں ہوگیا مسمار

خیرؔ تاریخ کوئی ''پاک'' نکال
وقنا ربنا عذاب النار

1465-23=1442ھ

□□□

ڈاکٹر سعید گورکھپوری
۱۰۷، رتن کمپاؤنڈ، گورکھپور

شمس الرحمٰن فاروقی اب کہاں اک اور رخصت ہوگیا

روئیں زمین و آسماں اک اور رخصت ہوگیا
شمس الرحمن اب کہاں اک اور رخصت ہوگیا

پیر و پیغمبراں اک اور رخصت ہوگیا
محسنِ اردو زباں اک اور رخصت ہوگیا

حسنِ فخرِ زماں اک اور رخصت ہوگیا
تھی خبر یہ ناگہاں اک اور رخصت ہوگیا

وہ چراغِ ضوفشاں اک اور رخصت ہوگیا
عہد کا سکہ رواں اک اور رخصت ہوگیا

عشق اردو میں جلا جو مدتوں اے دوستو
چھوڑ نقشِ جاوداں اک اور رخصت ہوگیا

فکر و فن اور آگہی کو کرگیا جو جاوداں
فکر کا قطبِ زماں اک اور رخصت ہوگیا

ایک ہنگامہ مچا تھا تیرے دم سے ہر طرف
عہد کا اہلِ زباں اک اور رخصت ہوگیا

گنتی کے ہی رہ گئے تھے تیرے جیسے حق شناس
کہتے ہیں باشندگاں اک اور رخصت ہوگیا

زندگی بھر گیسوئے اردو سنوارا ہائے اب
مرجعِ دانشوراں اک اور رخصت ہوگیا

استعارہ بن گیا جس کا ادب میں لفظ لفظ
کرشمۂ فن عیاں اک اور رخصت ہوگیا

اس کے دل میں تھا منور آگہی کا اک چراغ
اب امیرِ کارواں اک اور رخصت ہوگیا

جاتے جاتے دے گیا ہم کو چراغِ آگہی
کیسے، کب یہ خوش بیاں اک اور رخصت ہوگیا

یاد تڑپائے گی اس کی روز و شب ہر ایک کو
چھوڑ عظمت کا نشاں اک اور رخصت ہوگیا

اس کی تنقیدات سے ملتی رہے گی روشنی
نقش کا مردِ جواں اک اور رخصت ہوگیا

چاندنی فکر و نظر کی ہر سو بکھراتا رہا
اردو کا وہ قدرداں اک اور رخصت ہوگیا

اردو کی رسوائی اس کو زخم دیتی ہی رہی
حامیٔ فکر و بیاں اک اور رخصت ہوگیا

گلشن اردو کو سینچا جس نے اپنے خون سے
آج ایسا باغباں اک اور رخصت ہوگیا

اس کے غم میں غمزدہ ہیں آج سب کے دل سعیدؔ
نازشِ ہندوستاں اک اور رخصت ہوگیا

پروفیسر ظفر احمد صدیقی (رفتید ولی نہ از دل ما)



ڈاکٹر شکیل احمد

قاسمی منزل

ڈومن پورہ

مئوناتھ بھنجن

رابطہ: 9236722570

پروفیسر ظفر احمد صدیقی صاحب سے پہلی ملاقات تینتیس برس قبل جامعہ اسلامیہ ریوڑی تالاب، وارانسی میں ہوئی تھی اس سے قبل آپ سے غائبانہ تعارف استاذی ڈاکٹر انیس ادیب صاحب کی زبانی ہوا۔ انہیں دنوں ادیب صاحؔب کو بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی میں اپنے مقالہ کے نگراں پروفیسر امرت لعل عشرتؔ صاحب سے ملاقات کے لیے حاضر ہونا تھا۔ مجھے ادیب صاحب کی ہمراہی کا شرف حاصل ہوا۔ اس سفر میں مجھے شعبۂ اردو، عربی، فارسی میں حاضری کا پہلی بار موقع ملا۔ زینہ طے کرنے کے لیے قدم بڑھایا ہی تھا کہ پورچ میں اپنی دوپہیا گاڑی پر سوار ہوئے ہوئے ظفر احمد صدیقی صاحب نظر آئے میں صورت سے آشنا بھی نہیں تھا تب تک ادیب صاحؔب نے مایوسی کے انداز میں فرمایا کہ ''ظفر صاحب تو نکل گئے'' یعنی علیک سلیک کا موقع ہی نہ مل سکا۔ بس اتنا ہوا کہ پاجامہ شیروانی ٹوپی اور رومال میں ملبوس ظفر صاحب کی ایک جھلک پچاس قدم دور سے دیکھ سکا۔

چند ماہ کے بعد تنہا بنارس کا سفر ہوا۔ اس بار جامعہ اسلامیہ ریوڑی تالاب وارانسی میں حاضر ہوا اور حضرت مولانا اسیر آدروی صاحب سے ملاقات کا برسوں بعد شرف حاصل ہوا۔ اسیرؔ صاحب میرے والد محترم کے جامعہ قاسمیہ مرادآباد کے تعلق سے قائم حلقہ احباب میں تھے اور میں بچپن سے موصوف کو غریب خانہ پر تشریف لاتے اور والد مرحوم سے دورِ طالب علمی کی بے تکلفانہ گفتگو اور مرادآباد کے ماحول کی یاد تازہ کرتے سنا تھا۔ ہری گھاٹ ''اردو افسانوں میں سماجی مسائل کی عکاسی ابتدا سے ۱۹۴۷ء'' شائع ہو چکی تھی اس کی ایک جلد مولانا اسیر صاحب کی خدمت میں پیش کی۔ بعد میں اسیرؔ صاحب نے اس کتاب پر تفصیلی تبصرہ لکھا۔ جو ''آوازِ ملک'' کے سنڈے ایڈیشن میں شائع ہوا۔

اسیرؔ صاحب کی خدمت میں حاضری کے دوران ہی مولانا ظفر احمد صدیقی صاحب اپنے کمرے کے سامنے نظر آئے، اسیرؔ صاحب کے توسط سے میری پہلی ملاقات یہیں جامعہ اسلامیہ میں ہوئی۔

میں نے اپنی کتاب کی ایک جلد انہیں پیش کی۔آپ کے یونیورسٹی پہنچنے کا وقت ہورہا تھا اس لیے مختصر ملاقات اور تعارف کے سوا مزید گفتگو کا موقع نہ ملا سکا۔مگر ظفر صاحب نے یہ پیش کش ضرور کی کہ میں شعبۂ اردو یا جامعہ اسلامیہ میں اگلے کسی سفر میں ضرور ملاقات کروں۔ اس مختصر گفتگو اور پیش کش سے مجھے بہت حوصلہ ملا۔آپ کی خوش مزاجی اور خوش خلقی کا نقش میرے ذہن پر نقش ہوگیا۔اس کے بعد جامعہ اسلامیہ اور شعبۂ اردو میں آپ سے متعدد ملاقاتیں ہوئیں۔

پروفیسر ظفر احمد صدیقی صاحب ان دنوں شعبۂ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی میں لکچرر تھے اس سے برسوں پہلے آپ نے بحیثیت مدرس شعبۂ عربی جامعہ اسلامیہ میں ذمہ داری سنبھال رکھی تھی۔اسی جامعہ میں درس دینے کے دوران آپ نے بنارس ہندو یونیورسٹی سے بی۔اے اور ایم۔اے کیا۔آپ کی عربی فارسی اور اردو کی صلاحیت جامعہ اسلامیہ میں تدریسی خدمات سے اس وقت کے صدر شعبۂ اردو پروفیسر حکم چند نیّر صاحب متاثر ہوئے۔اور پھر ظفر صاحب صدر شعبۂ اردو میں استاد مقرر ہوگئے۔مگر جس جامعہ اسلامیہ ریوڑی تالاب میں انہوں نے تدریسی خدمات کا آغاز برسوں پہلے کیا تھا، یونیورسٹی میں لکچرر ہوجانے کے بعد بھی اس جامعہ سے تدریس کا تعلق باقی رکھا اور یونیورسٹی جانے سے قبل دو پیریڈ کا درس جامعہ میں اعزازی طور پر دیتے رہے۔آپ کا قیام جب تک وارانسی میں رہا جامعہ اسلامیہ میں اعزازی تدریسی خدمت کا سلسلہ باقی رہا۔ آپ کو جامعہ میں اسی مقصد سے ایک مناسب کمرہ بھی الاٹ کیا گیا جس میں درس سے متعلق کتابیں اور دیگر متعلقہ سہولیات فراہم کی گئی تھیں۔ظفر صاحب کی اس علم دوستی اور بے لوث دینی خدمت سے ان کی دیرینہ خاندانی علمی وراثت اور نسل در نسل علم دین اور خدمتِ خلق کا پہلو روشن ہوتا ہے۔

ظفر احمد صدیقی صاحب کا تعلق گھوسی ضلع مئو کے ایک نامور دینی علمی گھرانے سے تھا جس کی کئی صدیوں سے علمی اور دینی خدمات تھیں اور جن کے اثرات مشرقی یوپی کے کئی اضلاع تک پھیلے ہوئے تھے۔''تذکرہ علماء اعظم گڑھ'' کے مرتب کے مطابق:

''حضرت العلامہ مولانا صاحب علی خان بہادر بن دولت علی بن عبداللہ بن احمد بن لعل محمد بن ابراہیم بن شیخ بوڈھن بن ملک جلال بن ملک کمال صدیقی گھوسوی دسویں صدی ہجری میں اس دیار کے علمائے کبار میں سے تھے۔آپ کے مورث اعلیٰ ملک محمد کمال نے شہنشاہ جلال الدین اکبر کے عہد میں کڑہ مانک پور سے ترک سکونت کر کے قصبہ گھوسی کو اپنا موطن و مسکن بنایا یہیں ۱۲۰۹ھ میں مولانا صاحب علی کی ولادت ہوئی۔''

(تذکرہ علمائے اعظم گڑھ،ص/۱۶۷)

پروفیسر ظفر احمد صدیقی صاحب اسی علمی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ان کے مورثین نے اس دیار میں علم وفن کے چراغ روشن کرنے کے ساتھ کلکتہ تک اپنی صلاحیت کا لوہا منوایا۔ مرتب تذکرہ آگے لکھتے ہیں جس سے پورا تاریخی پس منظر سامنے آجاتا ہے:

''تحصیل و تکمیل کے بعد کلکتہ میں رئیس المتقین کے عہدہ پر مولانا (صاحب علی) کا تقرر ہوگیا پھر اس عہدہ سے ترقی کر کے ۱۲۴۲ھ میں حکومت برطانیہ کے گورنر جنرل ہند کے میر منشی منتخب ہوئے اس دور میں میری منشی کا عہدہ بڑا ہی اہم تھا۔ ۱۲۵۲ھ میں گورنر ہند کابل گیا تو مولانا صاحب علی کو بھی اپنے ہمراہ لے گیا۔مولانا نے وہاں دوسال قیام کیا اور اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی کے ساتھ وہاں کے علماء وفضلاء سے علمی استفادہ بھی کرتے رہے۔ آپ نے اپنے آبائی وطن قصبہ گھوسی میں ۱۲۵۵ھ میں ایک دینی درس گاہ کی بنیاد رکھی اور اس کے پہلو میں ایک عالی شان جامع مسجد بھی تعمیر کی ساتھ ہی ایک کتب خانہ بھی قائم کیا۔''

(تذکرہ علماء اعظم گڑھ،ص/۱۶۸)

پروفیسر ظفر احمد صدیقی کی ابتدائی تعلیم اسی دینی درس گاہ ''ناصر العلوم'' گھوسی میں ہوئی جس کے انتظام وانصرام کی ذمہ داری مولانا صاحب علی کے بعد پشت در پشت آپ کے خانوادے نے سنبھال رکھی تھی۔ناصر العلوم کے بعد آپ کی تعلیم کی تکمیل ''مظاہر علوم'' سہارن پور سے ہوئی اور دیگر اداروں سے بھی کسب علم کیا۔ بنارس اور علی گڑھ میں عمر کا بڑا حصہ گذارا لیکن گھوسی سے آپ کا تعلق پوری زندگی باقی رہا۔عیدین کی امامت آپ ہی کے سپرد تھی اور آپ اس موقع پر گھوسی ضرور تشریف لاتے تھے۔ لاک ڈاؤن کے باعث ۲۰۲۰ء میں عیدین کے موقع پر آپ علی گڑھ سے گھوسی کا سفر نہ کر سکے اور اس بار نماز عیدین کی امامت سے محروم رہے۔

ظفر احمد صدیقی صاحب کی پیدائش

۲۰/۱۹۵۵ء محلہ قاضی پور قصبہ گھوسی، ضلع مئو (ماضی کے اعظم گڑھ) کی ہے۔ ابتدائی برسوں میں یہیں حصول تعلیم کا سلسلہ قائم رہا۔ یہیں سے مختلف برسوں میں آپ نے جامعہ اردو علی گڑھ اور دیگر امتحانات بھی پرائیویٹ پاس کیے اور باضابطہ تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ جامعہ اسلامیہ ریوڑی تالاب میں تدریسی خدمات انجام دینے کے ساتھ بلکہ اس سے قبل ہی آپ کی تدریس اور تصنیفی صلاحیتوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ سہارن پور کے بعد بنارس میں آپ کو اپنی علمی پیاس بجھانے اور دوسروں کو علمی فیض پہنچانے کے مواقع ملے اور بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے وابستگی کے ساتھ آپ کی تمام تر علمی صلاحیتوں کو زیادہ وسیع میدان میسر آ گیا اور تصنیفی کاموں کا آغاز بھی یہیں سے ہوا۔

''تنقیدی موضوعات'' کے نام سے آپ کی پہلی تحقیقی کتاب ۱۹۸۳ء میں یہیں سے شائع ہوئی۔ اس بظاہر مختصر سی کتاب سے آپ کی تحقیقی کاموں کا آغاز ہوا مگر اس کتاب میں بھی جن موضوعات پر آپ نے اظہار خیال کیا اس سے آپ کی تحقیقی صلاحیتوں اور ناقدانہ بصیرتوں کے ساتھ فارسی اور عربی ادب میں بھرپور دست رس کا اندازہ بھی علمی حلقوں کو ہو گیا۔ اور چند برس بعد جب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں آپ کی تقرری بحیثیت ریڈر ہو گئی تو آپ نے یک سوئی کے س اتھ کارِ مفوضہ بھی انجام دیئے اور دل جمعی کے ساتھ تصنیفی اور تحقیقی کاموں میں بھی دل چسپی لی اور دیکھتے دیکھتے اگلے چند برس کے دوران آپ کی کئی اہم کتابیں منظر عام پر آ گئیں اور یہ سلسلہ آپ کے انتقال کے چند ماہ قبل تک جاری رہا۔ آپ کی کئی اہم کتابیں جن میں ترتیب دی گئی کتابیں بھی شامل ہیں ان کی تعداد کئی درجن ہے۔ جن میں ''تنقیدی معروضات'' کے علاوہ ''نقش معنیٰ'' مولانا شبلی بحیثیت سیرت نگاہ'' تحقیقی مقالات ''افکار وشخصیات''، ''شبلی کی علمی وادبی خدمات''، ''نظم طباطبائی''، ''انتخاب مومن''، ''انتخاب کلام آبرو''، ''شبلی معاصرین کی نظر میں''، ''شبلی شناسی کے اولین نقوش''، ''دیوان ناظم''، ''شرح

> ''تنقیدی موضوعات'' کے نام سے آپ کی پہلی تحقیقی کتاب ۱۹۸۳ء میں یہیں سے شائع ہوئی۔ اس بظاہر مختصر سی کتاب سے آپ کی تحقیقی کاموں کا آغاز ہوا مگر اس کتاب میں بھی جن موضوعات پر آپ نے اظہار خیال کیا اس سے آپ کی تحقیقی صلاحیتوں اور ناقدانہ بصیرتوں کے ساتھ فارسی اور عربی ادب میں بھرپور دست رس کا اندازہ بھی علمی حلقوں کو ہو گیا۔ اور چند برس بعد جب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں آپ کی تقرری بحیثیت ریڈر ہو گئی تو آپ نے یک سوئی کے س اتھ کارِ مفوضہ بھی انجام دیئے اور دل جمعی کے ساتھ تصنیفی اور تحقیقی کاموں میں بھی دلچسپی لی اور دیکھتے دیکھتے اگلے چند برس کے دوران آپ کی کئی اہم کتابیں منظر عام پر آ گئیں۔

دیوان مہدی وغالب''، ''مقالاتِ نذیر''، ''شبلی''، ''قصیدہ اصل ہیئت اور حدود''، ''مثنوی آرائش معشوق''، اور ''ابتدائی عربی'' جیسی کتابیں شامل ہیں۔

مذکورہ کتابوں کے علاوہ ظفر احمد صدیقی صاحب نے تقریباً پچپن کانفرنسوں اور ورک شاپ وغیرہ میں مقالات پیش کی اور کلیدی خطبات پیش کرنے کے ساتھ آپ کے پانچ سو کے قریب مقالات ومضامین ہندو پاک کے جرائد میں شائع ہو چکے ہی۔ ملک وبیرون ملک کے تین سو سے زاید سمیناروں میں حصہ لے مقالات پیش کرنے کے ساتھ ریسرچ اسکالرس کی رہنمائی بھی فرمائی۔ بنارس ہندو یونیورسٹی اور علی گڑھ یونیورسٹی میں مجموعی طور پر آپ کی نگرانی میں انیس ریسرچ اسکالرس کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی گئی۔ آپ نے جامعہ اسلامیہ ریوڑی تالاب بنارس کے علاوہ ۳۰/اپریل ۱۹۷۹ء تک بنارس ہندو یونیورسٹی اور ۲۰/دسمبر ۱۹۹۷ء سے ۳۱/اگست ۲۰۲۰ء تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں تدریسی خدمات پیش کیں۔ آپ کو علی گڑھ میں ریڈر، پروفیسر اور صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے ذمہ داریاں نبھانے کا گراں قدر موقع ملا۔ آپ نے اپنی بے لوث خدمات کے ذریعہ شعبہ میں اپنا نقش بھی قائم کیا۔ آپ کی شناخت اچھے استاد، بہترین عربی اور نگراں اور خوش مزاج وخوش خلق انسان کی تھی۔ آپ بہترین مقرر تھے آپ کی تقریر وتحریر میں آپ کی علمی بصیرت اور ظرف بینی کا خوب مشاہدہ ہوتا تھا۔ آپ کے لکچرر اور ریسرچ اسکالرس کی رہنمائی کی بھی یونیورسٹی حلقے میں شہرت تھی۔ خودنمائی اور مبالغہ آرائی سے کوسوں دور ہونے کے باوجود انفرادی اور اجتماعی گفتگو میں نہایت سنجیدہ، مخلص اور صاف گو انسان تھے۔

پروفیسر ظفر احمد صدیقی کا اچانک اس دنیا سے چلے جانا زبان وادب اور تحقیق وتدریس کے حلقے میں بہت بڑے خسارے کی صورت میں دیکھا جائے گا۔ آپ کے رٹائرمنٹ کو ابھی چند ماہ گزرے تھے اور علم وتحقیق کی دنیا میں

متعدد اہم کاموں کو سرانجام دینا آپ کے مشن کا حصہ تھا۔ ریسرچ اسکالر اور تنقید وتحقیق کے شیدائی ابھی آپ کی ذات گرامی سے بہت کچھ اور بہت دیر تک فیض حاصل کرنے کی تمنا رکھتے تھے مگر مشیت ایزدی کچھ اور ہی سامنے آئی۔ چند روزہ بیماری جان لیوا بن گئی آپ نے ۲۹؍دسمبر ۲۰۲۰ء کی دوپہر جان جان آفرین کے سپرد کردی۔ نماز جنازہ اگلی صبح ۳۰؍دسمبر ۲۰۲۰ء کو ادا کی گئی اور یونیورسٹی قبرستان علی گڑھ میں تدفین عمل میں آئی۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے اور پس ماندگان میں ورثا واقرباء کے علاوہ جو بہت بڑا علمی وادبی حلقہ شامل ہے انہیں صبر جمیل کی توفیق بخشے۔ آمین۔ مرحوم سے میرے تعلقات درس وتدریس سے متعلق تو نہ تھے لیکن آپ نے خاکسار کے ساتھ ایک مخلصانہ تعلق ہمیشہ رکھا۔ یاد کرتا ہوں تو آپ کی عنایات ایک ایک کرکے یاد آتی جارہی ہیں۔ جن کے اصل محرم محترم اسیرؔ اورویؔ صاحب تھے ۔ آپ کے توسط سے ملاقات کے بعد میرے لیے ایک نئی شاہراہ نکل آئی۔ بنارس ہندو یونیورسٹی سے کوئی تعلیمی تعلق نہ رکھنے کے باوجود یہاں کے شعبۂ اردو میں آمدورفت کے متعدد مواقع پیدا ہوتے رہے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ شعبۂ اردو اور یونیورسٹی سے متعلق کالج میں اردو لکچرر کی آسامی مشتہر ہوئی۔ میں بھی درخواست گزاروں میں شامل ہوگیا۔ آپ نے تقرری کے تعلق سے مجھے مشورے اور تعاون دونوں پیش کیے اور صدر شعبہ تک پہنچنے کے لیے میرے لیے آسانیاں پیدا کیں۔ یہ بات الگ رہی کہ ناگزیر حالات کے باعث مقررہ وقت پر انٹرویو کا انعقاد نہ ہوسکا اور تیسرے برس جب دوبارہ انٹرویو کی نوبت آئی تو اس دوران گنگا میں اتنا پانی بھر چکا تھا کہ سارا منظر بدل گیا اور میرے لیے کف افسوس ملنے کے سوا کچھ بھی نہ بچا۔ لیکن پروفیسر ظفر احمد صدیقی صاحب نے میری جو پُرخلوص مدد فرمائی وہ میرے لیے ایک نیا تجربہ تھا۔ آج کی بھاگ دوڑ بھری زندگی میں اس قدر خلوص کسے نصیب ہوتا ہے جو خاکسار کو آپ سے ملا۔ آج بھی

مجھے تینتیس برس قبل کے اس ماحول کو گئے دنوں میں شمار کرنا چاہئے جب آپ سے میرے تعلقات کا آغاز ہوا مگر ایسا ہوا نہیں آپ سے متعدد مواقع پر بنارس اور اعظم گڑھ میں جب بھی ملاقات ہوئی بے پناہ اپنائیت میرے حصے میں آئی۔ شاد عباسی اور ان کے صاحب زادے سلمان راغب نے ''ارتقاء'' کے اجراء کے موقع پر ایک ایک تقریب کا اہتمام کیا تھا جس میں آپ نے کلیدی تقریر فرمائی اور اردو زبان کے بارے میں یادگار تقریر سے حاضرین کو نوازا۔ میں نے بلامبالغہ اردو زبان کی ابتداء، اہمیت، شعری ادبی سرمائے اور بلاغت وقواعد پر مبنی ایسی تقریر اب تک نہیں سنی تھی۔ آپ نے اپریل کے سخت موسم میں بنارس تشریف لاکر جس اپنائیت، علم دوستی اور خوردنوازگی کا نمونہ پیش کیا وہ مثالی تھا۔

میرے دل سے آپ کے لیے دعا نکلتی ہے۔

مجھے تینتیس برس قبل کے اس ماحول کو گئے دنوں میں شمار کرنا چاہئے جب آپ سے میرے تعلقات کا آغاز ہوا مگر ایسا ہوا نہیں آپ سے متعدد مواقع پر بنارس اور اعظم گڑھ میں جب بھی ملاقات ہوئی بے پناہ اپنائیت میرے حصے میں آئی۔ شاد عباسی اور ان کے صاحب زادے سلمان راغب نے ''ارتقاء'' کے اجراء کے موقع پر ایک ایک تقریب کا اہتمام کیا تھا جس میں آپ نے کلیدی تقریر فرمائی اور اردو زبان کے بارے میں یادگار تقریر سے حاضرین کو نوازا۔ میں نے بلامبالغہ اردو زبان کی ابتداء، اہمیت، شعری ادبی سرمائے اور بلاغت وقواعد پر مبنی ایسی تقریر اب تک نہیں سنی تھی۔ آپ نے اپریل کے سخت موسم میں بنارس تشریف لاکر جس اپنائیت، علم دوستی اور خوردنوازگی کا نمونہ پیش کیا وہ مثالی تھا۔ سلمان راغب مرحوم آپ کے شاگرد تھے جن کی دعوت پر آپ نے اجراء کی تقریب میں شرکت اور کلیدی خطبہ پیش کیا۔ مجھے آپ کے انداز خطابت نے بہت متاثر کیا آپ کی کتابیں میرے مطالعہ میں رہ چکی ہیں اس لیے میں آپ کی تحریری اور تقریری خوبیوں کے ساتھ آپ کی تدریسی خوبیوں کا بھی گواہ ہوں کیونکہ مجھے دو ایک بار شعبۂ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی میں آپ کو کلاس لیتے بھی سننے کا موقع ملا تھا۔

آپ کی دیرینہ تدریسی، تصنیفی، تحقیقی اور مذہبی خدمات سے بہت بڑے حلقے نے فیض اٹھایا ہے جس کا دائرہ گھوسی، بنارس اور علی گڑھ تک وسیع۔ آپ کی صلاحیتوں کے اعتراف میں آپ کو متعدد اعزازات سے نوازا گیا۔ میرے نزدیک آپ کے شاگرد آپ کے لیے بہت بڑا اعزاز ہیں جنہوں نے آپ سے کسب علم کیا اور اب جب کہ ظفر احمد صدیقی صاحب ہمارے درمیان نہیں رہے یہ شاگرد آپ کا نام روشن کریں گے اور اردو دنیا ان کے توسط سے بھی آپ کی دیرینہ ہمہ جہت خدمات کو خراج تحسین پیش کرتی رہے گی۔

❑❑❑

پروفیسر ظفر احمد صدیقی: کچھ یادیں



عبدالرزاق

اسسٹنٹ پروفیسر (معاہداتی)
سینٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشنل
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

(۱) استادِ محترم پروفیسر ظفر احمد صدیقی سے ہماری پہلی ملاقات ۲۰۱۰ء میں ایم۔اے کی کلاس میں ہوئی تھی۔ قصیدے کا پرچہ ان سے متعلق تھا۔ دورانِ درس ان کا یہ معمول تھا کہ کلاس میں آنے کے بعد رجسٹر حاضری میں دیکھ کر کسی ایک طالب علم کا نام پکارتے اور اس سے عبارت پڑھنے کو کہتے۔ جتنے اشعار اس دن پڑھانے ہوتے اتنے اشعار کی قرات کراتے۔ عبارت خوانی میں جو اغلاط ہوتیں ان کی نشان دہی کرتے جاتے۔ متن کی قرات کے بعد ہر شعر کے لغوی و اصطلاحی معنی اور اس کے مفہوم کی وضاحت کرتے۔ اس کے بعد فرماتے ''لکھیے!'' اس کے بعد وہ تمام باتیں جو پہلے بیان کی گئی تھیں ان سب کو نوٹ کروا دیتے۔ شعر میں جو فنی خوبیاں ہوتیں ان کو بھی بیان کرتے۔ اس شعر کا ہم مضمون کوئی شعر اس شاعر کا یا کسی دوسرے شاعر کا موجود ہوتا تو وہ نوٹ کرا دیتے۔ اہم بات یہ ہے کہ یہ تمام چیزیں برجستہ اور زبانی ہوتی تھیں۔ اس کی تائید اس سے ہوئی کہ جب انھوں نے اپنی کتاب ''قصیدہ: اصل، ہیئت اور حدود'' (۲۰۲۰ء) کے تدریسِ متن والے حصے کی کتابت کروانے کا ارادہ کیا تو اپنے منتخب تلامذہ سے ان کی قصیدے کی کاپیاں حاصل کیں۔ ان کو پڑھا جو ترمیم و اضافے کرنے تھے کیے۔ اس کے بعد کتابت کے لیے دیے۔ کتاب کے پیش لفظ میں ان تمام حضرات کا نام بہ نام شکریہ بھی ادا کیا جن کی کاپیاں انھوں نے لی تھیں۔ ان کا کورس عموماً ایک ماہ قبل مکمل ہو جاتا تھا۔ ایک مہینہ میں نظرِ ثانی (Revision) کرا دیتے تھے۔

(۲) ۲۰۱۲ء میں یو جی سی کی جانب سے استاد کو ایک میجر پروجیکٹ حاصل ہوا۔ انھوں نے مجھے بلایا اور کہا آپ اس میں درخواست دے دیجیے۔ ہم نے حکم کی تعمیل میں درخواست دی۔ انٹرویو میں انھوں نے میری حمایت بھی کی۔ لیکن دیگر اساتذہ نے جو انٹرویو میں موجود تھے کہا کہ دو چیزیں (پروجیکٹ اور ریسرچ) ایک ساتھ نہیں ہو سکتیں نیز یہ مشورہ بھی دیا کہ آپ ریسرچ میں داخلہ لیں۔

یہ آپ کے لیے زیادہ بہتر ہے۔ لہٰذا میری جگہ دوسرے امیدوار کا انتخاب ہو گیا۔ اس کے بعد استادِ محترم از خود مجھے اپنے زیرِ نگرانی تحقیقی مقالہ لکھنے کی رضامندی ظاہر کی۔ خود ہی موضوع تجویز فرمایا۔ دورانِ ریسرچ ان کا معمول یہ تھا کہ وہ ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر ہی دیکھتے تھے۔

کمپیوٹر کتابت دیکھنے منع کرتے۔ ان کا کہنا تھا کہ کمپیوٹر کتابت دیکھنے میں پریشانی ہوتی ہے۔ اس میں کرکشن بنانے کی جگہ بھی کم ہوتی ہے۔ ان کی یہ بھی ہدایت تھی کہ آپ کسی رجسٹر میں لکھنے کے بجائے دستے کے مختلف کاغذات پر لکھ کر دکھائیں۔ تاکہ ضرورت پڑنے پر صفحات کو آگے پیچھے کیا جاسکے۔ رجسٹر میں یہ ممکن نہیں ہے۔ ریسرچ کا کام ہمیشہ سامنے بٹھا کر دیکھتے۔ جہاں غلطیاں ہوتیں زبانی بھی بتاتے اور قلم سے بھی بنادیتے۔ کہتے تھے جتنا کام ہوجائے دکھاتے جایئے۔ بہت زیادہ کام ایک ساتھ نہیں دیکھا جاتا ہے۔

(۳) پروفیسر ظفر احمد صدیقی ایک اچھے اور مشفق استاد ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہترین انسان بھی تھے۔ ان سے جب بھی ملاقات ہوتی یا فون پر گفتگو ہوتی تو سلام جواب کے بعد سب سے پہلے ان کے یہ جملے ہوتے ''عبدالرازق صاحب سب خیریت ہے۔ کوئی پریشانی تو نہیں ہے۔ والد صاحب کی طبیعت کیسی ہے۔'' وغیرہ وغیرہ۔ یہ ان کا معمول تھا۔ کسی بھی وقت ہم ان کو فون کرسکتے تھے۔ یا وہ ہم کو فون کرسکتے تھے۔ کوئی پابندی نہیں تھی۔ فجر کے بعد ظہر کے بعد رات میں گیارہ بجے کسی بھی وقت ان سے فون پر گفتگو کی جاسکتی تھی۔ یہاں تک کہ گھر آنے پر بھی کوئی پابندی نہیں تھی۔ بس یہ ہدایت تھی کہ آنے سے پہلے فون کرلیں تاکہ گھر پر موجود ہیں یا نہیں یہ معلوم ہوسکے۔ وہ اپنے معاملات بالکل صاف رکھتے تھے۔ ہمیں نہیں یاد کہ کبھی معمولی سے معمولی کام بھی انھوں نے کروایا ہو اور پیسے نہ دیے ہوں۔ بلکہ زائد ہی دیا کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ ہم آپ کو اِدھر اُدھر بھیجتے رہتے ہیں آپ کا پٹرول خرچ ہوتا ہوگا۔ پٹرول ڈلوالیجیے گا۔ اس کے لیے الگ سے پیسے دیا کرتے تھے۔ جب میرا سینٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشن میں بہ حیثیت اسسٹنٹ پروفیسر تقرر ہوا تو میں ان کے گھر مٹھائی لے کر گیا۔ اس پر وہ بہت ناراض ہوئے۔ کہا کہ میں ان چیزوں کو منع کرتا ہوں پھر بھی آپ کیوں لے آئے۔ بہ مشکل اس کو قبول کرنے کے لیے راضی ہوئے۔ اس کے بعد وہ پوچھتے رہے کہ تنخواہ ملنی شروع ہوئی یا نہیں۔ تنخواہ میں کچھ تاخیر ہوئی تو ایک دن فرمایا کہ آپ کو جب تک تنخواہ نہیں مل رہی ہے جتنی ضرورت ہو ہم سے پیسے لے لیں۔ جب تنخواہ آئے گی تو واپس کردیجیے گا۔ ان کا یہ بھی معمول تھا کہ کسی سے کوئی کام کروایا جس کا بل شعبے سے یا کسی اور ادارے سے پاس ہونا ہے اور اس میں تاخیر ہورہی ہے تو اپنے جیب سے پہلے ہی اس کا معاوضہ ادا کردیا کرتے تھے کہ جب بل پاس ہوجائے تو ادا کردیجیے گا۔ دورانِ ریسرچ ہمارے گھر میں چار شادیاں ہوئیں۔ تین چھوٹی بہنوں کی اور ایک میری۔ تین شادیوں میں وہ بہ اہتمام شریک ہوئے۔ چوتھی شادی ۱۳ر دسمبر ۲۰۲۰ء کو تھی۔ اس وقت وہ آئی سی یو میں ایڈمٹ تھے۔ لیکن ذہن پورے طور پر حاضر تھا۔ ۱۳ر دسمبر کو پونے بارہ بجے دن میں ان کے صاحبزادے سعد کے نمبر سے میرے پاس فون آیا میں ڈرا کہ اللہ خیر کرے۔ میں نے فون اٹھا یا تو سعد نے کہا ابو آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد استانے کہا ''بیٹا! ہماری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ابھی ہم دعائیہ شرکت کررہے ہیں۔ جب ہماری طبیعت ٹھیک ہوجائے گی تو آپ کا نوید ہم بھجوا دیں گے۔ ہمارے لیے اچھی والی دعا کیجیے کہ میں ٹھیک ہوجاؤں۔ آپ حافظ ہیں قرآن شریف پڑھ کر دعا کیجیے۔'' اتنی بات کرکے فون کاٹ دیا۔ انھوں نے اپنے گھر والوں کو بھی ہدایت کردی تھی کہ عبدالرازق مصروف ہیں۔ ان کو کوئی زحمت نہ دی جائے۔ ان باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہمہ وقت دوسروں کی ضرورتوں کا کتنا خیال کرتے تھے۔ جب میرا ریسرچ میں داخلہ ہوا تو میرے پاس سائیکل تھی جس سے میں شعبہ آتا جاتا تھا۔ فرمانے لگے آپ ایک گاڑی لے لیجیے۔ سائیکل سے آپ تھک جاتے ہوں گے۔ ہم نے کہا سر ابھی ہمارے پاس اس کا انتظام نہیں ہے۔ خیر کچھ دنوں کے بعد والد صاحب وغیرہ کی مدد سے میں نے ایک گاڑی لے لی۔ جب ان کو بتایا تو بہت خوش ہوئے۔ پھر پوچھا کہ یہ انتظام کیسے ہوا؟ میں نے بتایا کہ کچھ والد صاحب نے مدد کی ہے۔ کچھ میں نے اپنے اسکالرشپ سے لیا ہے۔ بات اس وقت ختم ہوگئی۔ جب سر کو میں نے اپنی بہن کی شادی کا دعوت نامہ دیا تو سر نے دس ہزار روپے کی رقم عنایت فرمائی۔ کہا میں آپ کی بائک کی خریداری میں شریک ہونا چاہتا تھا آپ نے از خود انتظام کرکے لے لی تو میں نہیں دے سکا۔ یہ رقم آپ رکھ لیں اور والد صاحب کو ہدیہ کردیجیے گا۔ ساتھ یہ بھی فرمایا کہ میرا نام لینے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ آپ اپنی طرف سے ہی ان کو پیش کردیجیے گا۔

باتیں بہت سی ہیں۔ سرسری طور پر جو یاد آتا گیا۔ وہ غیر منظم انداز میں لکھ دیا ہے۔ یہ بات کہنے میں کوئی قباحت نہیں کہ ان کے جانے سے ہم روحانی طور پر یتیم ہوگئے۔ ابھی بھی ہر وقت ان کا سراپا ہماری نظروں کے سامنے چلتا پھرتا اور بات کرتا نظر آتا ہے۔

❑❑❑

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے



ڈاکٹر اکبر علی

مدیر
روزنامہ آگ
لکھنؤ

استادمکرم پروفیسر فضل امام رضوی کے انتقال سے دانشوری کے اس دور کا خاتمہ ہوگیا جس کی شمع پروفیسر احتشام حسین نے روشن کی تھی۔ پروفیسر مرحوم ادبی جلسوں کی کامیابی کی ضمانت ہوا کرتے تھے۔ان کی طبیعت اتنی سہل پسند واقع ہوتی تھی کہ عالمی سیمناروں اور چند احباب پر مشتمل ادبی مجلس ہر جگہ وہ بہت ہی آسانی سے جلوہ افروز ہوا کرتے تھے۔

انہوں نے کبھی بھی قدآور اپنی ادبی حیثیت کو احباب سے قربت اور بے تکلف ہونے میں مانع نہ ہونے دیا۔مفتی گنج سجادیہ کالونی واقع ان کا دانش کدہ ہر خاص وعام کے لیے ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔کسی کو اپنی کتاب کا اجرا کرانا ہو یا کسی کو ادبی بزم سجانی ہو استادمحترم کے وسیع قلب کی ہی طرح ان کی کشادہ رہائش گاہ کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے تھے۔اہل گورکھپور کے لیے ان کی محبت ومروت کچھ زیادہ ہی تھی اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ انہوں نے گورکھپور یونیورسٹی سے علم ودانش حاصل کیا۔

پروفیسر محمود الٰہی جو گورکھپور یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے سربراہ تھے اور کم وبیش ۳۳ برسوں تک انہوں نے خواجہ احمد فاروقی سابق صدر شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی کی طرح گورکھپور کے شعبہ اردو کو اپنے خون جگر سے سینچا تھا۔کہا جاتا تھا کہ یوپی کی دو یونیورسٹیوں بنارس ہندو یونیورسٹی اور گورکھپور یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے صدور کو طویل مدت تک اپنے شعبوں کی خدمات انجام دینے کا موقع ملا۔میری مراد پروفیسر حکم چند نیّر اور پروفیسر محمود الٰہی صاحبان ہیں۔ پروفیسر فضل امام رضوی نے پروفیسر محمود الٰہی کی نگرانی میں امیر اللہ تسلیم پر ۱۹۷۴ میں پی ایچ ڈی کا مقالہ تحریر کیا اور 1980 میں انہوں نے انیس شخصیت اور فن پر پروفیسر محمود الٰہی کی ہی نگرانی میں ڈی لٹ کا مقالہ سپرد قلم کیا۔

آج بھی گورکھپور یونیورسٹی کی لائبریری کے ریسرچ ہال میں مرحوم کے تحقیقی مقالات مخطوطے کی شکل میں تحقیق وتنقید کی دنیا میں قدم رکھنے والے ریسرچ اسکالروں کو حوصلہ بخشتے ہیں کہ وہ شعبہ اردو کی توانا روایات کا حصہ بننے جا رہے ہیں۔

ایس این انٹر کالج فیض آباد سے اپنی تدریسی خدمات کا آغاز کرنے والے پروفیسر فضل امام رضوی نے کے ایم ایل کے کالج گونڈہ کے صدر شعبہ اردو ہونے کے بعد پھر راجستھان یونیورسٹی جے پور کے صدر شعبہ مقرر ہوئے۔ آخر میں یوپی کی آکسفورڈ یونیورسٹی کے نام سے مشہور الہ آباد یونیورسٹی کے صدر شعبہ اردو مقرر ہوئے اور یہاں سے وہ باقاعدہ ملازمت سے سبکدوش ہوئے لیکن کہا جاتا ہے کہ پروفیسر کبھی سبکدوش نہیں ہوتا تو فضل امام صاحب نے بھی اس روایت کو احسن طریقہ سے انجام دیا اور اپنی یادگار اتنی کتابیں چھوڑی ہیں جو تشنگان ادب کو ہمیشہ سیراب کرتی رہیں گی۔ پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ کے مقالات کے علاوہ مثنوی خنجر عشق کی ترتیب ومقدمہ، بھوجپوری ادب کا تعارف، جدید ہندی شاعری ،سمت ورفتار، مثنوی نغمہ مسلسل یا گوہر انتخاب، افکار ونظریات، انیس شناسی، موازنہ انیس ودبیر (ترتیب ومقدمہ) شاعر آخرالزماں ،جوش ملیح آبادی، مشرقی انتقادیات، اصول ونظریات، انتخاب کلام حسرت (انتخاب ومقدمہ) تذکرہ جلوہ خضر صفیر بلگرامی (انتخاب ومقدمہ) دیوان دردکا نقش اول (تحقیق ترتیب ومقدمہ) اردو شناسی (قواعد واملا) راجستھانی زبان وادب ایک تعارف (تاریخ وتنقید) امعان نظر، تنقیدی معیار، مطالعہ عارف، جدید مرثیہ، علامہ اقبال کی اساس فکر کے علاوہ ہندی اور انگریزی ادب پر ان کی تحریر کردہ کتابیں فضل امام صاحب کی یاد کو زندہ رکھیں گی۔

جیسا کہ میں نے قبل میں تحریر کیا کہ پروفیسر فضل صاحب کو گورکھپور سے ایک تعلق خاص تھا تو انہوں نے ساری زندگی اس تعلق خاص کی پاسداری کی۔ گورکھپور یونیورسٹی کے شعبہ اردو کی کوئی بھی تقریب ہو فضل امام صاحب کی شرکت لازمی تھی۔ اورینٹیشن کورس ہو یا پھر ریفریشر کورس یا پھر کوئی ادبی جلسہ یا پی ایچ ڈی اور ایم اے سال آخر کا زبانی امتحان فضل امام صاحب کی شرکت کے بغیر ان کے انعقاد کا تصور محال تھا۔ پروفیسر فضل امام کی بنیاد تو عربی

ایس این انٹر کالج فیض آباد سے اپنی تدریسی خدمات کا آغاز کرنے والے پروفیسر فضل امام رضوی نے کے ایم ایل کے کالج گونڈہ کے صدر شعبہ اردو ہونے کے بعد پھر راجستھان یونیورسٹی جے پور کے صدر شعبہ مقرر ہوئے۔ آخر میں یوپی کی آکسفورڈ یونیورسٹی کے نام سے مشہور الہ آباد یونیورسٹی کے صدر شعبہ اردو مقرر ہوئے اور یہاں سے وہ باقاعدہ ملازمت سے سبکدوش ہوئے لیکن کہا جاتا ہے کہ پروفیسر کبھی سبکدوش نہیں ہوتا تو فضل امام صاحب نے بھی اس روایت کو احسن طریقہ سے انجام دیا اور اپنی یادگار اتنی کتابیں چھوڑی ہیں جو تشنگان ادب کو ہمیشہ سیراب کرتی رہیں گی۔

اور فارسی تعلیم کی تھی بعد میں انہوں نے عصری تعلیم پر توجہ دی اور انگریزی ،ہندی ،سنسکرت ،اودھی، راجستھانی زبانوں پر عبور حاصل کیا۔ وہ بہترین مقرر تھے اس لیے گورکھپور یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے سبھی جلسوں میں وہ کلیدی مقرر ہوا کرتے تھے۔ جب وہ تقریر کرتے تھے تو اردو، فارسی کے ساتھ ساتھ سنسکرت کے فی البدیہ اشعار پیش کر کے اپنے زور خطابت کا سکہ دلوں پر بٹھانے میں کامیاب رہتے تھے۔

خاکسار سے بھی مرحوم گورکھپور کے تعلق سے خاص انسیت رکھتے تھے۔ اکثر فون کر کے خیریت دریافت کرتے تھے۔ ایک دفعہ میں نے عرض کیا تھا کہ آپ شاعر بھی ہیں اس لیے میری خواہش ہے کہ آگ اخبار میں آپ کی غزلیں بھی شائع ہوں تو انہوں نے شفقت فرماتے ہوئے اپنی غزلیں آگ میں شائع کرانا شروع کر دیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ میں اپنا شعری مجموعہ ترتیب دے رہا ہوں اور اس میں آگ کا خصوصی ذکر ہوگا۔ بیمار ہونے سے دو روز قبل رات میں انہوں نے مجھ کو فون کر کے کہا تھا کہ میں مشاعرے کے تعلق سے ایک مضمون تحریر کر رہا ہوں تم اس کو آگ میں شائع کرنا۔ ہائے افسوس کہ موت نے انہیں مہلت نہیں دی اور مضمون آگ میں شائع ہونے سے محروم رہ گیا۔

میں استاد مرحوم کی شریک حیات اور ان کے ورثا سے تعزیت پیش کرتے ہوئے گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ پروفیسر فضل امام صاحب کا جو ادبی سرمایہ اشاعت کی منزل سے نہیں گزر سکا ہے اس کو جلد سے جلد شائع کرایا جائے۔ پروفیسر فضل امام ادبی محفلوں کی جان اور شان ہونے کے ساتھ زینت منبر بھی تھے اور ذکر امام حسین بڑے دلسوز انداز میں کرتے تھے۔ امام عالی مقام کی محبت میں سرشار اس ذاکر حسین کو موت نے بھی گیارہ محرم کو گلے سے لگالیا۔ میری چشم تصور یہ منظر دیکھ رہی ہے کہ خلد میں بھی وہ ذکر حسین مظلوم میں مصروف اور گریہ کناں ہیں۔

❑❑❑

پروفیسر فضل امام پرستار مولانا ابوالکلام



ڈاکٹر ریحان حسن

شعبۂ اردو و فارسی

گرونانک دیو یونیورسٹی

امرتسر

رابطہ: 8559020015

پروفیسر فضل امام اپنے علم و فضل، انکسار و اخلاق، شفقت و محبت، جامعیت علم و فن اور تعلیمی، تحقیقی اور معاشرتی خدمات کے اعتبار سے علمی حلقوں میں منفرد و ممتاز تھے، آپ کی علمی اور تدریسی خدمات کا دائرہ کافی وسیع بھی ہے اور رنگا رنگ بھی۔ وہ اردو زبان کے ان گنے چنے ادیبوں میں تھے، جنھیں اردو، عربی، فارسی، ہندی، سنسکرت اور انگریزی زبانوں پر بھی قدرت تھی۔ مختلف زبانوں کے ادب سے واقفیت نے ان کے تنقیدی نظریات و خیالات کو منفرد بنا دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ پروفیسر فضل امام کی تنقید نگاری افراط و تفریط کا شکار نہ تھی بلکہ ان کے تنقیدی مضامین میں محتاط روی اور حق شناسی تھی۔ جیسا کہ ان کے متعدد مضامین سے ظاہر ہے، ایسا نہیں کہ انھوں نے تنقیدی مضامین میں بزرگوں کا احترام پیش نظر نہ رکھا ہو بلکہ ناقدین کے احترام کو ملحوظ خاطر نظر رکھتے ہوئے دلائل و براہین کے ساتھ اختلاف رائے کیا جو ان کیا وسعت مطالعہ کا بین ثبوت ہے۔

ان کے، مضامین کے افکار و نظریات، تحقیقی، علمی اور استدلالی انداز میں ادب پارے کو فن کی کسوٹی پر پرکھنے کے رواج کو تقویت دی جسکے ثبوت میں میر انیس، امیر اللہ تسلیم، جوش ملیح آبادی اور مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ کے فکر و فن پر رقم کی ہوئی تحریروں کو پیش کیا جا سکتا ہے۔

پروفیسر فضل امام صاحب کی ادبی خدمات کا احاطہ کوزے میں سمندر کو قید کرنے کے مترادف ہے اس لیے ہم ان کی مجموعی ادبی خدمات کا احاطہ تو نہیں کر سکتے۔ البتہ مولانا ابوالکلام آزاد کے ایک معتقد کی حیثیت سے اس مختصر مقالے میں ان کے فکر و فن سے بحث کی جا سکتی ہے۔

بلاشبہ مولانا ابوالکلام آزاد نادر روزگار شخصیت تھے وہ ایسے زمانہ میں تھے جبکہ ملک پر پیمبری وقت آ پڑا تھا۔ لہٰذا مولانا نے ملک و قوم کے لیے پوری زندگی تج دی مولانا ابوالکلام آزاد کن دشوار ترین منزل سے گذر رہے تھے اس کی وضاحت پروفیسر فضل امام یوں کرتے ہیں:

''وہ تاریخ کے اس دوراہے پر کھڑی تھے جہاں سے کسی ایک راستے کو اپنا لینا انتہائی دشوار گذار تھا مگر وہ بے خوف و خطر اس راستے پر گامزن ہو گئے جو ان کی آزادی ضمیر کے جوہر کو

انمول بنانے والا تھا۔ مولانا کے لیے یہ دور انتہائی نازک تھا جس راستے پر وہ گامزن ہوئے وہ تلوار سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک تھا وہ انتہاؤں کے درمیان ان کا وجود علم وعمل کو حوصلہ بخشتا رہا۔''

(تنقیدی معیار، مولانا ابوالکلام آزاد ایک ہمہ جہت شخصیت، ص ر ۴۳)

مولانا نے ملک وقوم کی متعدد طریقوں سے رہنمائی کی او روہ ہرمنزل میں کامیاب وکامران بھی ہوئے اور اس طرح ان کی شخصیت کا زاویہ، زاویۂ مثلث قرار پایا جیسا کہ پروفیسر فضل امام نے کہا ہے:

''ان کی شخصیت ایک طرح کا مثلث ہے جو سیاست ادب اور مذہب کے زاویوں میں جلوہ گر ہوتی ہے۔''

(ایضاً، ص ر ۴۳)

مولانا ابوالکلام نے سیاست کے میدان میں بھی ایسا قدم جمایا کہ ان کے پائے ثبات میں اس وقت بھی لغزش پیدا نہ ہوسکی جبکہ ان کو ناقابل بیان کیفیتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ان کے عزم وہمت کو دیکھ کر ان کے دوست ہی نہیں بلکہ دشمن بھی ان کی فکری بصیرت اور ذہنی جودت کے قائل ہوگئے اور وہ بھی اس حد تک کہ ان کے مشورے کے بغیر کوئی کام کرنا یا کوئی جلسہ منعقد ہونا ناممکن سا ہوگیا اور ایسا کیوں نہ ہوتا سا لیے کہ بقول پروفیسر فضل امام:

''ان کی گرفت میں ماضی اور حال ہی نہیں مستقبل بھی تھا۔ وہ بہت دور سے تاریخ کے قدموں کی آہٹ جان لیتے تھے اور اس آہٹ میں چھپے ہوئے طوفانوں کو پہچان لیتے تھے۔''

(ایضاً، ص ر ۴۷)

اس طرح پروفیسر فضل امام نے مولانا ابوالکلام آزاد کی سیاسی بصیرت سوجھ بوجھ اور ان کے ذریعہ کیے گئے تاریخی فیصلے کے وہ تمام سیاق وسباق قاری کے سامنے روز روشن کے مثل عیاں ہوجاتے ہیں کہ جس پس منظر کی بدولت ان میں یہ صلاحیت پیدا ہوئی تھی اور وہ اس لائق ہوسکے تھے کہ ملک وقوم کے متعلق فیصلہ کرسکیں۔

پروفیسر فضل امام نے مولانا ابوالکلام کے سیاسی نظریات پر بہت ہی مدلل اور تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے مولانا کی زندگی کے اہم مورخ صحافت وادب پر بھی کماحقہ روشنی ڈالی ہے۔ اور یہ باور کرایا ہے کہ انہوں نے اپنی جولانی قلم کے ذریعہ صحاب وادب کو جو بیش قیمت تحائف عطا کیے ہیں اس کے لیے ادبی دنیا ہمیشہ گراں بار رہے گی۔ مولانا کی ادبی خدمات کا احاطہ کرتے ہوئے وہ رقم طراز ہیں:

''وہ صحافت جس کو انہوں نے اپنی جولانیٔ قلم سے ادبیت عطا کردی اور جب دنیائے فصاحت کے مطلع عالم تاب پر ان کی بلاغت کے شب وروز ''الہلال'' بن کر نمودار ہونے لگے تو اس کا ''تذکرہ'' بڑی آزادی سے ہونے لگا اور ان کے قلم کی ''الہلالی'' تنویریں ''لسان الصدق'' بن کر قرآن حکیم کی ترجمانی کرنے لگیں۔ انہیں جب قید خانہ کی اندھیری کوٹھری میں نور سحر ملا تو ''غبار خاطر'' کے روپ میں قندیل ادب نگاہوں کو نگارخانۂ انانیت کے جلوۂ صدرنگ دکھانے لگی۔ مولانا نے شاعری بھی کی اور ''محب جمال'' بھی رہے مگر وہ جلد ہی ''جمال مستی'' سے نکل کر ''جلال عشق مستی'' کے ترجمان بن کر ''کمال عشق مستی'' کے گرویدہ بن گئے۔ انہوں نے اپنے رشحات قلم سے حریم قوم ووطن کے افسانوں پر شعروادب کے صنم سجادیئے اور شعروشریعت کے تضادات کو ایسا ہم رنگ کردیا کہ ان کے ادبی سبو میں جہاں شراب حافظ شیراز کے مطہر قطرات ہیں وہیں غزالی کے تلقینی افکار بھی۔''

(ایضاً ص ر ۴۹)

ڈاکٹر فضل امام نے ان چند سطور میں مولانا ابوالکلام آزاد کی صحافت اور ادبی قدروقیمت کو اس حسین انداز میں بیان کیا ہے کہ مولانا کی ادبی خدمات نظروں کے سامنے آگئی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ فضل امام کی قلمی پختگی اور ادائے خطابت پر جو گرفت حاصل ہے اس کا بھی اندازہ کسی حد تک ہوجاتا ہے جس کے ثبوت میں یہ تراشہ بھی دیکھیں:

''مولانا آزاد کے طرز نگارش کی سب سے نمایاں صفت ہی ہے کہ ان کی پوری شخصیت اس میں جھلکتی ہے۔ ان کے قلم کی وسعت اور ہمہ گیری ہر جملے میں نظر آتی ہے۔ ترکی، عربی، فارسی اور اردو کے مستند شعراء کا شعری مزاج اور ان کا ادبی ضمیر مولانا کی تحریروں میں رچا بسا ہوا ہے اور اس پر مستزاد ان کی انانیت کا پرتو ہے۔ اس لیے ان کی تحریریں عشق وجنون کا حسین امتزاج بن گئی ہیں۔''

(ایضاً، ص ر ۵۰)

مولانا آزاد کی مذہبی شخصیت کا جائزہ لیتے ہوئے انہوں نے یہ بتایا ہے کہ دراصل مولانا کی نظر میں انسانیت ہی سب سے بڑا مذہب تھا۔ اس لیے انہوں نے تمام ادیان کو بہتر

اور یکساں تسلیم کرتے ہوئے قرآن کی تفسیر بھی اس انداز سے تحریر کی کہ اتحاد واتفاق اور بقائے باہم کا جذبہ پیدا ہو۔ انہوں نے اپنی تحریر وتقریر کے ذریعے صرف مسلمانوں کو مخاطب نہیں کیا بلکہ تمام انسانوں سے خطاب کیا جیسا کہ پروفیسر فضل امام ان کی مذہبی شخصیت پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''مولانا کے مذہبی انداز نظر میں صرف مسلمان ہی نہیں رہے بلکہ تمام دنیا کے انسانوں کو وہ اپنا مخاطب قرار دیتے ہیں لیکن اکثر وبیشتر ان کی تفسیر، تفسیر بالرائے بھی بن جاتی ہے جس سے اختلاف کے باوجود ہندوستان کی تاریخ کے پس منظر اور طویل تناظر میں یہ بات تسلیم کی جاسکتی ہے کہ ایسا مولانا نے اتحاد واتفاق کے لیے کیا ہوگا جو دینی تعلیمات اور مذہبی احکامات کی روح ہے۔''

(ایضاً، ص/ ۵۳)

پروفیسر فضل امام ابوالکلام آزاد کے پیغام اتحاد سے بہت ہی متاثر ہیں اور اس سلسلے میں ان کے ''نظریۂ وحدت ادیان'' کی متعدد طریقوں سے تعبیر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مولانا کے ان خیالات کو تقویت پہنچانے کے لیے اپنے مجموعے ''تنقیدی معیار'' میں اپنے ایک مضمون کا عنوان ہی ''مولانا آزاد اور نظریۂ وحدت ادیان'' قائم کیا ہے اور یہ باور کرانے کی سعیٔ مشکور کی ہے کہ دراصل:

''وہ کٹرپن اور تنگ نظری کو روح اسلام کے منافی سمجھتے تھے اور وہ مذہب کی اصل روح انسان دوستی اور امداد باہمی گردانتے ہیں چاہے جو بھی طریقۂ عبادت ہو وہ منزل حق تک پہنچا دیتا ہے۔''

(مولانا ابوالکلام آزاد اور نظریۂ وحدت ادیان، تنقیدی معیار، ص/ ۵۷)

مولانا کے ان خیالات کی تائید کرتے ہوئے پروفیسر فضل امام نے بتایا ہے کہ دراصل مولانا نے اپنے ان افکار کے ذریعے قومی یکجہتی کا پیغام اس لیے بھی دیا کیونکہ

''وہ ہندوستان میں مختلف مذاہب اور ان کے ماننے والوں میں اتحاد ویگانگت چاہتے ہیں۔'' (ایضاً، ص/ ۵۸)

یہ اظہر من الشمس ہے کہ قومی یکجہتی کے بغیر ہندوستان کے لوگوں کو انگریزوں کے پنجۂ استبداد سے نجات نہیں مل سکتی تھی۔ اس لیے مولانا اتحاد واتفاق کو قائم رکھنے کے لیے مسلمانوں کے لیے قرآن کی تفسیر اس طرح بیان کی کہ مسلمانوں کو یہ یقین ہو کہ اتحاد ویگانگت کی تعلیم وہ دراصل ازروئے قرآن واسلام دے رہے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے اس طریقۂ کار کی پروفیسر فضل امام وضاحت اس طرح کرتے ہیں:

''مولانا ابوالکلام آزاد کی ذات گرامی قدردین اور سیاست کے حسین امتزاج کا ایک پیکر تھی اور ان کا ''نظریۂ وحدت ادیان'' بھی جہاں ایک طرف دین کے اساسی پہلوؤں کا امانت دار تھا وہیں دوسری طرف سیاسی اغراض ومقاصد کا آئینہ دار بھی اور ظاہر ہے کہ دین اور سیاست کو جدا بھی نہیں کیا جاسکتا ہے۔''

(ایضاً، ص/ ۶۷)

مندرجہ بالا اقتباسات سے یہ بخوبی واضح ہے کہ وہ مولانا ابوالکلام کے تفکرات وتخیلات سے بہت حد تک متفق ہیں اور ان کے تفکرات کے ذریعے ملک وقوم میں اتحاد واتفاق کو دیکھنے کے خواہاں ہیں۔

پروفیسر فضل امام کی ان تحریروں سے یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ اپنے مقالات کے لیے مواد اور حقائق کو پوری محنت ولگن سے پہلے جمع کرتے ہیں اور انتہائی تفکر وتدبر کے بعد اپنے نتائج کو صفحۂ قرطاس پر لاتے ہیں اور اس طرح اپنے قارئین کو نئے نکات اور انفرادی خصوصیتوں سے متعارف کراتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ''تنقیدی معیار'' میں مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت سے متعلق مضامین میں مولانا کی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے قاری کو روشناس کراتے ہوئے یہ باور کرایا ہے کہ مولانا ہمہ جہت شخصیت کے حامل تھے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کے تفکرات وتخیلات سے محض صحاح ادب اور مذہب سے تعلق رکھنے والے افراد ہی اکتساب نہ کریں بلکہ ان کے ارشادات وقول سے ہمارے ملک کے تمام مکتبہ فکر کے افراد مستفیض ہوسکتے ہیں۔ خواہ ان کے الہلال والبلاغ میں شائع شدہ مضامین ہوں یا غبار خاطر کے مکاتیب ان کے تمام مقالات ومکاتیب اور تقریروں میں ہر مکتبۂ خیال کے لوگوں کے لیے ایسا ابدی پیغام ہے جس سے انسانوں کو صحیح راستہ مل سکتا ہے۔ لہٰذا ان کے بتائے ہوئے راستے کو مشعل راہ بنانے کی ضرورت ہے تاکہ سرمایۂ حیات حاصل ہوجائے۔

پروفیسر فضل امام کے ان مضامین کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ابوالکلام آزاد کی تحریر وتقریر کے مداح ہی نہیں بلکہ ان کی انوکھی شخصیت کے معترف بھی ہیں۔

❑❑❑

ڈاکٹر مخمور کاکوروی
رابطہ: 9450097929

قطعۂ تاریخ وفات
(۳۱/اگست ۲۰۲۰ء)

پروفیسر فضل امام رضوی

آئینۂ اب و جد فضلِ امام رضوی
تھے پیروِ محمدؐ فضلِ امام رضوی

عالم، ادیب، ناقد اور شاعر و محقق
علم و ادب کا معہد فضلِ امام رضوی

اردو ہو، فارسی ہو، عربی ہو یا ہو ہندی
اونچا ہے ہر جگہ قد فضلِ امام رضوی

اعمال صالحہ میں ساری حیات گزری
روشن رہے گا مرقد فضلِ امام رضوی

خلق خدا کی خدمت میں پیش پیش رہنا
تھا زندگی کا مقصد فضلِ امام رضوی

علم و ادب کی محفل جب بھی کہیں سجے گی
آئیں گے یاد سید فضلِ امام رضوی

تھی خاک جس جگہ کی آخر وہیں پہ پہنچی
مدفن بنا ہے مولد فضلِ امام رضوی

مخمورؔ کہہ رہا ہے مجھ سے سروش غیبی
تاریخ رحلت از 'حد فضلِ امام رضوی'
۲۰۲۰ء

□□□

غزل

ٹوٹ جاؤں نہ کہیں آ کے بچالے مجھ کو
مَیں ترا خواب ہوں آنکھوں میں سجالے مجھ کو

کوششیں تجھ کو بھلانے کی بہت کیں لیکن
راس آئے ہی نہیں ساغر و پیالے مجھ کو

کب تلک اور مَیں بھٹکوں یوں ہی پاگل پاگل
جستجو اب یہ تری مار نہ ڈالے مجھ کو

ایک بھی پل کے لئے جس کا اعتبار نہیں
کر گیا کون اِس ہستی کے حوالے مجھ کو

چھوڑ دی زخم کی پرواہ مَیں نے جس دن سے
حوصلہ دینے لگے پاؤں کے چھالے مجھ کو

احبار الٰہی
ہنسور، امبیڈکر نگر، یوپی
موبائل: 6388579963

غزل

محفل میں صرف جھوٹ بیاں کر رہے ہیں آپ
ناپاک خود ہی اپنی زباں کر رہے ہیں آپ

اب کیا سزا دیں آپ کو شرمندگی سے جب
'اپنے گناہ خود ہی بیاں کر رہے ہیں آپ'

رب نے عطا کیا ہے جو گنجینہ اس کو خرچ
کرنا کہاں تھا اور کہاں کر رہے ہیں آپ

جب لے کے ساتھ آپ وہاں جا نہ پائیں گے
پھر نام اپنے کیوں یہ جہاں کر رہے ہیں آپ

جس کے سبب یہ جان لٹا دوں میں آپ پر
برتاؤ ویسا مجھ سے کہاں کر رہے ہیں آپ

بابا آزاد جرولی
جرول، بہرائچ
موبائل: 9651057622

غزل

تمہاری یاد کو دل میں بساکے رکھا ہے
چراغ تیز ہوا میں جلا کے رکھا ہے

اداس اداس ہیں کلیاں، اڑی اڑی رنگت
یہ حال کس نے چمن کا بنا کے رکھا ہے

اب آئے آئے تو کیسے اسے قرار آئے
شب فراق نے دل کو جلا کے رکھا ہے

نہ کوئی ماہ جبیں ہے نہ کوئی زہرہ جبیں
یہ سب تو حسنِ نظر نے بنا کے رکھا ہے

فضائے شہر کی رنگیں گھٹن سے دور بہت
کھلی فضا میں حسیں گھر بنا کے رکھا ہے

تمہاری ذات سے وابستہ راز کو ہم نے
بڑے سلیقے سے دل میں چھپا کے رکھا ہے

غلط ہے سوچ لے پتھر سے گھاس کی امید
یہ کس کے سامنے سر کو جھکا کے رکھا ہے

ڈاکٹر اختر ریاض
ٹاور۔۲۔بی۲۰۹،تاسیانی گولف دیوا پارٹمنٹ،گولف سٹی لکھنؤ
موبائل: 9431448749

غزل

ہماری آنکھ ابھی منظروں سے خالی ہے
کہ جیسے سیپ کوئی موتیوں سے خالی ہے

کبھی بھی شاخ تمنا مری ہری نہ ہوئی
زمین دل تو مری بارشوں سے خالی ہے

اسی لئے تو قدم کے نشاں نہیں ملتے
یہ رہ گزر تو ابھی آہٹوں سے خالی ہے

ابھی کتاب کی قیمت کوئی لگائے کیا
کتاب دل تو ترے تذکروں سے خالی ہے

نہ بارشوں کا ہے موسم نہ سرد جھونکے کہیں
مری حیات ابھی موسموں سے خالی ہے

ہم اپنے چہرے کے زخموں کو دیکھتے کیسے
ہمارا شہر ظفرؔ آئینوں سے خالی ہے

ظفر اقبال ظفرؔ
170، کھیلدار، فتح پو، یوپی
موبائل: 9236692111

کیرالا میں اُردو کا فروغ



کے پی شمس الدین

اردو منیجر اے۔ایم ہائی اسکول،
تروکاڈ، انگادی پورم، ملاپورم
کیرالہ
رابطہ: 9847422682

• ہندوستان کی دوسری ریاستوں کی بہ نسبت ریاست کیرالا میں اُردو زبان وادب کا آغاز بہت بعد کو ہوا۔ پھر بھی کیرالا کے ملیالیوں نے ملیالم کے ساتھ ساتھ اُردو زبان کی آبیاری میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ کیوں کہ پیار ومحبت کے گیت بکھیرنے والی، شفقت ومروّت کا درس دینے والی، یکجہتی اور میل ملاپ کی طرف راغب کرنے والی، اپنے اخلاق سے دلوں کو موہ لینے والی، اپنی تہذیب سے انسان کو جینا سکھانے والی اس زبان کی ہمہ گیریت، صلاحیت اور مقبولیت کو ملیالیوں نے بھانپ لیا۔ اور اس کے فروغ کے لیے کمر کس لیا۔ وسیع دل کے مالک کیرالا والے تنگ دل اور تنگ نظر سے پرے ہیں۔ تنگ نظری کی وجہ سے ہی ہندوستان میں سب سے زیادہ بولی اور سمجھی جانے والی زبان کو آج کچھ لوگ ہندی کے نام سے یاد کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کبھی اُردو کا گہوارہ سمجھی جانے والی ریاست اتر پردیش میں آج ہر جگہ یہاں تک کہ لکھنؤ میں بھی سارے سائن بورڈ ہندی میں دکھائی دیتے ہیں۔ یہ بڑے افسوس کی بات ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اُردو مسلمانوں کی زبان ہے لیکن ہم نے تو لکھنؤ کی مسجدوں میں بھی ہندی کے سائن بورڈ اور تختیاں دیکھے ہیں۔ لیکن جنوبی ہند میں حالات کچھ اور ہیں۔ لوگ اُردو کی جانب قدم بڑھا رہے ہیں۔ خاص طور پر کیرالا جیسی غیر اُردو ریاست میں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان کی تمام ریاستوں میں کیرالا ہر حیثیت سے ایک الگ اور منفرد مقام حاصل ہے۔ بلا کسی مذہب وملت، ذات پات اور طبقے وفرقے کی تفریق کے یہاں کے سبھی لوگوں کی زبان یکساں طور پر ملیالم ہے۔ ہندو، مسلم، عیسائی، جین وغیرہ سبھی لوگ ملیالم زبان ہی لکھتے پڑھتے بولتے اور اپنے سارے کام کاج اسی زبان کے ذریعے چلاتے ہیں۔ ایسی صورت میں اس ریاست میں کسی دوسری زبان کا پنپنا اور فروغ پانا جوئے شیر لانے سے کچھ کم نہیں ہے۔

ویسے تو یہاں اُردو کی آمد چودھویں صدی کے دوران خلجی حکمرانوں کی آمد کے وقت ہوئی، اس بات سے ہم سبھی واقف ہیں کہ خلجی حکمرانوں کی درباری زبان فارسی تھی اور عام لوگوں کی بول چال کی زبان ابتدائی اُردو تھی جسے ہندی، ہندوی، دکنی وغیرہ کئی اور نام بھی دیے گئے تھے۔

۱۳۱۰ء میں علاؤالدین خلجی کے دورحکومت میں موجودہ کیرالا ریاست، ملابار، کوچین، ٹراونکور (ترونداپورم) کے ناموں سے علاقائی صوبوں میں منقسم تھی۔ اس دور میں ان تینوں صوبوں میں خلجی افواج کی آمدورفت کی وجہ سے ان کی بولی کے اثرات یہاں کے لوگوں پر پڑنے شروع ہوئے۔ اس کے بعد اسی طرح دکن کے بہمنی سلاطین اور ٹراونکور کے راجاؤں کے درمیان اچھے مراسم تھے۔ جس کی وجہ سے ان کے فوجی میل ملاپ سے بھی اُردو زبان کا ہیر پھیر ہونے لگا۔ اسی طرح ملابار میں پرتگالیوں کے تسلّط کا خاتمہ کرنے کے لیے یہاں کے راجا سامودری نے بیجاپور کے عادل شاہی سلطنت سے فوجی امداد کے لیے درخواست کی۔ اس درخواست کو قبول کرتے ہوئے عادل شاہی سلطان نے ۱۵۷۱ء میں اپنی فوج کالی کٹ بھیجی اور پرتگیزوں سے جنگ لڑکر چالیام کے قلعہ پر فتح حاصل کروایا۔ اس کے بعد سیکڑوں عادل شاہی سپاہی یہیں مستقل قیام پذیر رہے جن کی بولی اُردو تھی جس کی بدولت اُردو کے کئی ایک الفاظ ملیالم میں شامل ہونے لگے۔

اٹھارہویں صدی عیسوی میں حیدرعلی اور ٹیپو سلطان کی سلطنت کیرالا تک پھیل گئی تھی۔ اسی دور میں کیرالا میں اُردو زبان بھی تیزی کے ساتھ ترقی کرنے لگی۔ ٹیپو سلطان کے زمانے میں ملابار کے ایک علاقے کنّور میں اراکّل راجا حکومت کرتا تھا جو علاقہ ملابار میں واحد مسلم حکمران تھا۔ ٹیپو سلطان اور اراکّل رجا کے بیچ دوستانہ تعلقات تھے۔ جس کی وجہ سے کنّور میں اُردو زبان کو تقویت حاصل ہوئی۔ اس کے علاوہ کیرالا میں سب سے پہلے دینی مدارس کی شروعات بھی یہیں سے ہوئی۔ اس سے پہلے صرف مساجد کی حد تک چھوٹے چھوٹے مکتبوں میں ہی دینی تعلیم ہوا کرتی تھی۔ جب باقاعدہ طور پر دینی مدارس کی شروعات ہوئی تو ان میں اُردو زبان کی تعلیم بھی ہونے لگی۔

اسی طرح ٹیپو سلطان کے کوچین کے راجاؤں سے بھی قریبی مراسم تھے۔ کوچین کے راجا کے تریپونی ترا شاہی محل میں اُردو سیکھنے اور سکھانے کے لیے ایک کمرہ مختص کیا گیا تھا۔ اُردو سکھانے کے لیے حیدرآباد، میسور اور بمبئی سے اساتذہ آیا کرتے تھے۔ یہاں صرف شاہی خاندان کے لوگوں اور وزیروں کو ہی اُردو سکھائی جاتی تھی۔ سلطنت خداداد کے وزیروں سے رابطہ قائم کرنے اور دوسری سرکاری ضروریات کے لیے اُردو سیکھنا ضروری سمجھا جاتا تھا۔

ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد انگریزوں نے جنوبی ہند میں اپنے قدم جمائے تو انہوں نے حکومت کی سہولت کے لیے کیرالا میں بھی اُردو سیکھنے اور سکھانے کے لیے چند اسکولوں میں اُردو زبان کی تعلیم کی سہولتیں فراہم کروایا۔ اسی طرح ٹراونکور موجودہ ترونند پورم علاقے میں بھی انگریزوں نے ہندوستانی ایسکورٹ اسکول کے نام سے اسکول قائم کیے تھے۔ ان میں اُردو تعلیم کی سہولتیں بھی مہیا کی گئی تھیں۔ اس سلسلہ میں ٹراونکور راجاؤں کا تعاون حاصل رہا۔ ان کی قائم کردہ ٹراونکور یونیورسٹی (موجودہ کیرالا یونیورسٹی میں بھی اُردو تعلیم دی جاتی تھی۔ یہاں اُردو ادیبِ فاضل کورس کا انتظام بھی تھا۔ جس کو بعد میں جب کالی کٹ یونیورسٹی قائم ہوئی تو وہاں منتقل کردیا گیا۔

جب انگریزوں کے خلاف سارے ہندوستان میں غصے کی لہر شروع ہوئی اور آزادی کے لیے جنگ چھڑ گئی تو کیرالا میں بھی انگریزوں خلاف شورش شروع ہوگئی۔ ۱۹۲۱ء میں انگریزوں کے خلاف ملابار میں گھمسان لڑائی ہوئی۔ اسی میں خلافت تحریک بھی شامل تھی۔ اسی لیے ان دنوں اُردو زبان کے اثرات بہت زیادہ پڑنے لگے۔ خصوصاً ملابار علاقہ میں۔

زمانہ گذرتا گیا کیرالا میں اُردو کا چلن عام ہورہا تھا تو ہندوستان کا بٹوارہ ہوگیا۔ ایک طرف آزادی کی خوشی اور دوسری طرف تقسیم کا المیہ تھا۔ ہندوستان کے بٹوارے سے ہندوستان گیر سطح پر اُردو زبان ہی کو سب سے زیادہ نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ جب کہ کیرالا میں اُردو زبان ابھی طفل شیرخوار ہی تھی۔ اس وقت سارے ہندوستان میں اس زبان کا گلا گھونٹنے کی باتیں ہو رہی تھیں۔ لیکن جس زبان میں گنگا جمنی تہذیب، مذہبی رواداری کی چاشنی ہو وہ کسی کے دبانے سے کیسے دب سکتی تھی۔

حالات گزرتے گئے تقسیم کے المیہ کا زخم بھرتا گیا اور اُردو اپنی خوش خلقی کی وجہ سے سب کے سامنے ڈٹ کر کھڑے ہونے لگی۔ 'اُردو کی بقا کے لیے ۱۹۵۳ء میں کیرالا کے بابائے اُردو سید محمد سرورؔ صاحب اور ان کے رفقاء نے 'انجمن اشاعتِ اُردو' قائم کیے۔ ۱۹۶۳ء میں ولاپٹنم عبداللہ صاحب نے 'اُردو پرچار سبھا' قائم کی۔ ۱۹۷۱ء میں کے۔ٹی۔سی۔ بیران صاحب نے 'اُردو پرچار سمیتی' قائم کی۔ یہ تینوں تنظیمیں شہر کالی کٹ میں قائم کی گئی تھیں۔ ۱۹۷۲ء میں ایس۔ایم۔سرورؔ صاحب کی سرپرستی میں 'ملاپرم اُردو ڈیولپمنٹ ایسوسیشن' قائم کیا گیا۔ تلشیری میں اُردو کی نیم مردہ جسم میں جان ڈالنے کے

لیے ۱۹۷۴ء میں اسحٰق فقیر صاحب نے 'انجمن اصلاح اللسان' کو از سرِ نو تشکیل دی۔ یہ تمام تنظیمیں اپنے اپنے طرز وانداز میں اُردو کی خدمات انجام دیتے ہوئے اس زبان کی ترقی وترویج میں پیش پیش رہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کیرالا کے سرکاری اسکولوں میں اُردو تعلیم عام ہونے لگی۔ ۱۹۶۸ء تک کیرالا میں گنتی کے صرف سات اسکولوں میں اُردو کی تعلیم کی سہولت مہیا تھی۔ محبانِ اُردو کی تحریک اور اُردو داں طبقے کی مسلسل جدوجہد کے نتیجے میں ۱۹۷۰ء کے دہے میں کئی اسکولوں میں اُردو تعلیم کی سہولیات مہیا ہوئیں۔ پھر ان اسکولوں کی تعداد سیکڑوں میں بدل گئی۔ اس بنا پر کیرالا میں ستّر کے دہے کو اُردو کا سنہرا دور کہا جاسکتا ہے۔

اس وقت کیرالا میں اُردو کی موجودہ صورتِ حال یہ ہے کہ یہ شیریں زبان اپنے بل بوتے پر کھڑی ہے اور ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ ریاست کیرالا میں ضلع پتنم تِٹّھا کو چھوڑ کر بقیہ تیرہ اضلاع کے اسکولوں میں اُردو تعلیم کی سہولیات مہیا ہیں۔ ضلع ملاپرم، کنّور اور کالی کٹ میں سب سے زیادہ اُردو پڑھنے والے طلباء کی تعداد ہے۔ پوری ریاست میں پانچویں سے دسویں تک اختیاری زبان کی حیثیت سے اُردو پڑھنے والے طلباء کی تعداد ایک لاکھ گیارہ ہزار سے تجاوز کر گئی ہے اور اُردو اساتذہ کی تعداد دو ہزار کے قریب ہے جن میں چالیس فی صد اساتذہ غیر مسلم ہیں۔

کیرالا کے اسکولوں میں جب اُردو تعلیم کا آغاز ہوا تو اس وقت ریاستی تعلیمی بورڈ کی مرتب کردہ کوئی اُردو درسی کتاب موجود نہیں تھی۔ آندھرا پردیش اور تمل ناڈو کی پہلی سے پانچویں جماعت تک کی اُردو درسی کتابیں کیرالا میں پانچویں سے دسویں جماعت تک پڑھائی جاتی تھیں۔ اس لیے کہ کیرالا میں اُردو زبان کسی کی بھی مادری زبان اُردو نہ ہونے کی وجہ سے اُردو زبان کی تعلیم پانچویں جماعت سے ہی شروع ہوتی ہے۔ لیکن اب ۱۹۸۰ء سے اس معاملے میں ریاست کیرالا خود کفیل بن گئی ہے۔ فی الوقت کیرالا کی ایس۔سی۔ای۔آر۔ٹی۔ کے ماتحت پانچویں سے بارہویں جماعت تک کے لیے اُردو درسی کتابیں تیار کی جارہی ہیں۔ ضلع کاسرکوڈ جو کہ ریاست کرناٹک کا سرحدی ضلع بھی ہے۔ یہاں ایک گاؤں 'اُپلا' میں ہندوستانی اسکول کے نام سے ایک اپر پرائمری اسکول ہے، جہاں پہلی جماعت سے ہی اُردو پڑھائی جاتی ہے۔ اس لحاظ سے ریاست کیرالا میں پہلی جماعت سے ہی اُردو پڑھائی جانے والی واحد اسکول ہے۔ ۱۹۸۰ء سے اُردو کتابوں کی تیاری میں خود کفیل ہونے پر بھی پہلی سے چوتھی جماعت تک کی کتابیں تیار نہیں کی جارہی تھیں۔ لیکن اب اس معاملے میں بھی کیرالا خود کفیل ہوکر پہلی سے چوتھی جماعت تک کی اُردو کتابیں تیار کی گئی ہیں۔ یہ درسی کتابیں ابھی منظرِ عام پر آنا باقی ہیں۔ عنقریب ان کتابوں کا رسمِ اجرا کیا جائے گا۔

اساتذہ کی رہنمائی کے لیے 'ٹیچر ٹیکسٹ' کے نام سے بھی کتابیں تیار کی جاتی ہیں۔ ان کتابوں کی تیاری میں کیرالا کے اُردو اساتذہ کے علاوہ بیرونِ کیرالا سے ماہرانِ اُردو اور ماہرانِ تعلیم بھی حصہ لیتے ہیں۔ جن کے گراں قدر مشوروں کے ساتھ کتابیں تیار کی جاتی ہیں۔ یہ درسی کتابیں ہر پانچ سال کے بعد تجدید کی جاتی ہیں۔ اس کام کے لیے ایس۔سی۔ای۔آر۔ٹی۔ کے اُردو ریسرچ آفیسر کی زیرِ نگرانی اُردو اساتذہ پر مبنی ورک شاپ اکثر منعقد ہوتے رہتے ہیں۔ اسی طرح اُردو اساتذہ کو درپیش مسائل کے حل کے لیے اور اسکولوں میں اُردو کی تعلیمی صورتِ حال کی جانچ پڑتال کے لیے بھی کیرالا سرکار کے ڈپارٹمنٹ آف جنرل ایجوکیشن میں ایک اُردو اسپیشل آفیسر کا بھی تقرر عمل میں آیا ہے۔

ریاست کیرالا میں تقریباً پچاس سرکاری اور سو سے زائد سرکاری امداد یافتہ نجی کالج موجود ہیں۔ ان میں گیارہ کالجوں میں اُردو کی تعلیم دی جارہی ہے۔ ان کالجوں میں مختلف اُردو کے پروگرام اور سیمینار منعقد کیے جاتے ہیں۔ ۱۹۷۲ء میں قائم کردہ گورنمنٹ کالج ملاپرم میں ۱۹۸۴ء کو 'آل انڈیا یونیورسٹی اُردو ٹیچرس ایسوسیشن' کی سالانہ کانفرنس بھی منعقد کی گئی تھی۔ اس وقت یہاں آل انڈیا مشاعرہ بھی ہوا تھا۔ آزادی کے بعد غالباً وہ کیرالا کا اوّلین مشاعرہ تھا تب سے یہاں مشاعرے بھی منعقد کیے جا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ 'قومی کونسل فروغ برائے اُردو زبان' اور یو۔جی۔سی۔ کی مالی امداد سے بھی کیرالا میں مختلف موضوعات پر سیمینار منعقد کیے جاتے رہتے ہیں مستقبل میں بھی اس طرح کے اور بھی سیمینار منعقد کیے جانے کے امکانات ہیں۔

سرکاری کالجوں میں گورنمنٹ برنّن کالج تلشیری کیرالا کے قدیم کالجوں میں سے ایک ہے۔ ۱۸۹۰ء میں قائم شدہ اس کالج میں ابتدائی دور سے ہی اُردو تعلیم کی سہولیات مہیا ہیں۔ کنّور یونیورسٹی سے ملحق اس کالج میں اُردو پڑھنے والے غیر مسلم طلباء کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے۔ اس کالج کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ

یہاں اُردو طلباء کے لیے ہر کورس میں دو فی صد تحفظات کا انتظام بھی ہے۔ گورنمنٹ کالج ملاپرم، گورنمنٹ برنن کالج تلشیری، شری شنکر آچاریہ یونیورسٹی کالج کوئیلانڈی، فاروق کالج کالی کٹ اور سرسید کالج تلی پرمبا میں وقتاً فوقتاً اُردو سیمینار اور مختلف غزل پروگرام بھی منعقد ہوتے رہتے ہیں۔

جب کیرالا میں اُردو زبان کی تعلیم دینی مدرسوں اور سرکاری اسکولوں سے نکل کر ترقی کی راہیں طے کرتے ہوئے کالج کی سطح تک پہنچی تو کالجوں میں اُردو پڑھانے کے لیے ملیالیوں میں سے کوئی بھی ڈگری یافتہ قابل اُردو استاد نہیں تھا۔ ان خدمات کے لیے کالجوں میں اُردو پڑھانے کے لیے بیرونِ کیرالا سے اُردو میں تعلیم یافتہ پوسٹ گریجویٹ اساتذہ کو لانا پڑتا تھا۔ ان خدمات کے لیے کیرالا کے باہر دوسری ریاستوں کرناٹک، تامل ناڈو اور آندھرا پردیش سے جو لوگ آئے تھے ان میں یوسف کوکن صاحب، شاکر صاحب، ابراہیم صاحب، ڈاکٹر قدرت اللہ صاحب، میر احمد علی صاحب، غوث محی الدین صاحب، ڈاکٹر عبدالرحمن ثاقب صاحب، ڈاکٹر شہزادی بیگم صاحبہ، ڈاکٹر محمد یعقوب شریف صاحب، ڈاکٹر عبد الغفار صاحب، ڈاکٹر عطاء اللہ خان سنجری صاحب اور افسر باشاہ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن خوشی کی بات یہ ہے کہ کیرالا اس معاملے میں اب خود کفیل ہوگیا ہے۔ فی الحال ڈاکٹر عطاء اللہ خان سنجری صاحب اور ڈاکٹر افسر باشاہ کو چھوڑ کر کیرالا کے جن گیارہ کالجوں میں اُردو پڑھائی جا رہی ہے ان میں ملیالی اُردو اساتذہ ہی اُردو پڑھا رہے ہیں۔

کیرالا میں ہر پانچ سال میں حکومتیں بدلتی رہتی ہیں۔ پانچ سال متحدہ جمہوری محاذ (یو۔ڈی۔ایف) تو پانچ سال بایاں متحدہ جمہوری محاذ (ایل۔ڈی۔ایف) گزشتہ متحدہ جمہوری محاذ کے پانچ سالہ حکومت کے دوران ۲۲ سرکاری کالج قائم کیے گئے۔ جن میں پانچ سرکاری کالج میں اُردو تعلیم کی سہولت مہیا کی گئی (۲۰۱۲ء میں قائم کیے گئے گورنمنٹ کالج کونڈوٹی میں بی۔اے۔ اُردو ڈگری کورس کی حیثیت سے، گورنمنٹ کالج منکڈ ا اور گورنمنٹ کالج کڈولّی میں اُردو زبانِ ثانی کی حیثیت سے تعلیم حاصل کرنے کی سہولت مہیا کی گئی۔ ۲۰۱۳ء میں قائم کردہ گورنمنٹ کالج کُٹّا منگلم اور ۲۰۱۴ء میں قائم کیا گیا گورنمنٹ ویمنس کالج ملاپرم میں بھی اُردو سیکنڈ لینگویج کی حیثیت سے تعلیم حاصل کرنے کی سہولت مہیا کی گئی ہے)۔ اس کے علاوہ کالی کٹ یونیورسٹی کے تحت اُردو میں بی۔ایڈ۔ کرنے کی سہولت بھی یہاں مہیا ہے۔ ۲۸/فروری ۲۰۱۱ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا علاقائی مرکز (آف کیمپس) کیرالا کے ضلع ملاپرم میں قائم کیا گیا۔ اگست ۲۰۱۳ء سے یہاں اُردو بی۔ایڈ۔ کورس بھی شروع کیا گیا۔ اس مرکز میں بھی وقتاً فوقتاً اُردو کے مختلف پروگرام منعقد کیے جاتے ہیں۔ کیرالا سرکار کے تحت کالی کٹ اور ملاپرم میں گورنمنٹ ٹیچر ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ میں اُردو میں ڈی۔ایل۔ای۔ڈی۔ (ڈپلومہ اِن لینگویج ایجوکیشن) کورس کی سہولت بھی مہیا کی گئی ہے۔ اس کورس میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد کیرالا کے ہائی اسکولوں میں اُردو معلم بن سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان دونوں مراکز میں مرکزی حکومت کے گائڈ لائن کے تحت اپر پرائمری اسکولوں کے اُردو اساتذہ کے لیے ڈی۔ایل۔ایڈ۔ (ڈپلومہ اِن ایلیمینٹری ایجوکیشن) کورس بھی منعقد کیے جاتے ہیں۔

یونیورسٹی سطح پر کیرالا میں شری شنکر آچاریہ یونیورسٹی آف سنسکرت کے ریجنل سینٹرل 'کوئیلانڈی' میں اُردو ڈگری، پی۔جی۔، ایم فِل اور پی۔ایچ۔ڈی۔ کرنے کی سہولتیں مہیا کی گئی ہیں۔ اگر میں صحیح ہوں تو ہندوستان بھر کی ساری سنسکرت یونیورسٹیوں میں اُردو زبان وادب کی تعلیم کی سہولت اگر کہیں ہے تو وہ صرف کیرالا کی شنکر آچاریہ یونیورسٹی آف سنسکرت کی ہے۔ جو گنگا جمنی تہذیب کی زندہ مثال ہے۔ شری شنکر آچاریہ یونیورسٹی آف سنسکرت کے ریجنل سینٹر کے اوّلین صدر شعبہء اُردو میسور کے ڈاکٹر قدرت اللہ صاحب تھے۔ ان کی سبکدوشی کے بعد شہر 'کالی کٹ' میں موجود فاروق آرٹس اینڈ سائنس اور پی۔جی۔ کالج کی صدر شعبہء اُردو محترمہ ڈاکٹر صفیہ بی صاحبہ یہاں کی صدر شعبہء اُردو اور پھر اس سینٹر کی ڈائریکٹر بن گئیں۔ ان کی سبکدوشی کے بعد ڈاکٹر عطاء اللہ خان سنجری صدر شعبہء اُردو اور پھر اس کے ڈائریکٹر بن گئے۔ پھر ڈاکٹر کے۔وی۔ نکولن بھی صدر شعبہء اُردو، پھر اس سینٹر کے ڈائریکٹر ہوئے۔ نکولن صاحب کی سبکدوشی کے بعد ڈاکٹر عطاء اللہ خان سنجری پھر ایک اور بار صدر شعبہء اُردو کے عہدے پر فائز ہوگئے۔ اسی طرح یہاں کی ایک اور ریاستی یونیورسٹی جو کنّور یونیورسٹی کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں حالانکہ یہاں مستقل طور پر کوئی اُردو شعبہ نہیں ہے لیکن اُردو میں ریسرچ کرنے کی سہولت فراہم کی گئی ہے۔

یہاں سب سے پہلے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے والے گورنمنٹ کالج ملاپرم کے سابق صدر شعبہء اُردو ڈاکٹر پی۔کے۔ابوبکر صاحب ہیں۔ اسی طرح یہاں کی ایک اور ریاستی یونیورسٹی جو کالی کٹ یونیورسٹی کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں بھی باقاعدہ طور پر کوئی اُردو شعبہ نہیں ہے۔لیکن پھر بھی اس کے تحت اُردو میں ادیبِ فاضل کورس کرنے کی سہولت ہے۔اس یونیورسٹی کے تحت ادیبِ فاضل کورس کرنے والوں کو تعلیم دینے کے لیے ریاست کے مختلف علاقوں جیسے کالی کٹ، ملاپرم، ترشور، وائناڈ، پالکاڈ، کولّم، کنّور وغیرہ میں نجی طور پر اُردو کالج کے نام سے کوچنگ سینٹر چلائے جارہے ہیں۔

کالی کٹ یونیورسٹی میں صدر شعبہء عربی کی حیثیت سے پروفیسر احتشام حسین ندوی صاحب جب کام کر رہے تھے تو انہوں نے اپنے اثر ورسوخ سے شعبہء عربی میں ہی اُردو ریسرچ کرنے کا فرمان جاری کروایا اور محترمہ صفیہ بی صاحبہ کو اپنی نگرانی میں پی۔ایچ۔ڈی۔کروایا۔جن کا تذکرہ اوپر کیا گیا ہے۔اس طرح محترمہ صفیہ بی صاحبہ کالی کٹ یونیورسٹی میں اُردو زبان وادب میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے والی پہلی خاتون ہوئیں۔ فی الحال کالی کٹ یونیورسٹی میں شعبہ اُردو قائم کروانے کے لیے کیرالا اُردو ٹیچرس ایسوسیشن نے اپنی کوششیں تیز کر دی ہے۔ ان شاء اللہ امید قوی ہے کہ مستقبل قریب میں یہاں شعبہ اُردو قائم ہو جائے گا۔

حیدر آباد کے مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی کا اسٹڈی سینٹر بھی کیرالا میں موجود ہے۔ کیرالا میں اُردو اساتذہ کے لیے مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی اور سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لینگویجس (سی۔آئی۔آئی۔ایل۔) مختلف طرح کے ریفیشر کورس منعقد کرتے رہتے ہیں۔ تقریباً کیرالا کے ہر ضلع میں سی۔آئی۔آئی۔ایل۔اور مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی تربیتی پروگرام منعقد کر چکے ہیں۔ دونوں ادارے اپنے اپنے مراکز میں دعوت دے کر کیرالا کے اُردو اساتذہ کے لیے تربیتی

> کالی کٹ یونیورسٹی میں صدر شعبہء عربی کی حیثیت سے پروفیسر احتشام حسین ندوی صاحب جب کام کر رہے تھے تو انہوں نے اپنے اثر ورسوخ سے شعبہء عربی میں ہی اُردو ریسرچ کرنے کا فرمان جاری کروایا اور محترمہ صفیہ بی صاحبہ کو اپنی نگرانی میں پی۔ایچ۔ڈی۔کروایا۔جن کا تذکرہ اوپر کیا گیا ہے۔اس طرح محترمہ صفیہ بی صاحبہ کالی کٹ یونیورسٹی میں اُردو زبان وادب میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے والی پہلی خاتون ہوئیں۔ فی الحال کالی کٹ یونیورسٹی میں شعبہ اُردو قائم کروانے کے لیے کیرالا اُردو ٹیچرس ایسوسیشن نے اپنی کوششیں تیز کر دی ہے۔ ان شاء اللہ امید قوی ہے کہ مستقبل قریب میں یہاں شعبہ اُردو قائم ہوجائے گا۔

پروگرام بھی منعقد کر چکے ہیں۔اس کے علاوہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جامعہ ہمدرد نے بھی کیرالا کے اُردو اساتذہ کے لیے علی گڑھ اور دہلی میں تربیتی پروگرام منعقد کر چکے ہیں۔اس کے علاوہ این۔سی۔ای۔آر۔ٹی۔ بھی کیرالا میں اُردو اساتذہ کے لیے پروگرام منعقد کرتے رہتے ہیں۔ ایس۔سی۔ای۔آر۔ٹی۔ کیرالا وقتاً فوقتاً اُردو اساتذہ کے لیے مختلف طرز کے اُردو پروگرام کرتی رہتی ہے۔اسٹیٹ انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشنل اینڈ ٹرائننگ، کیرالا (سیمٹ) میں بھی ہر سال اُردو اساتذہ کے لیے مینجمنٹ کورس منعقد کیا جاتا ہے۔

کیرالا میں اُردو زبان کی ترقی وترویج کے لیے قائم کی گئی سب سے پہلی انجمن 'انجمن اصلاح اللسان' ہے جسے حاجی اسحٰق حاجی عبد الستار سیٹھ صاحب اور رفقاء نے ۵ ستمبر ۱۹۳۱ء میں قائم کیا۔ ۷ نومبر ۱۹۴۳ء میں کالی کٹ کے ٹاؤن ہال میں محبانِ اُردو کی جانب سے ایک اُردو کانفرنس منعقد کی گئی تھی۔اس کانفرنس کے افتتاح کے لیے بابائے اُردو مولوی عبد الحق اور ڈاکٹر عبد الحق دونوں تشریف لائے تھے۔ اس کانفرنس میں 'انجمن ترقی اُردو' ملابار شاخ قائم کی گئی۔ ۱۹۴۷ء کے حالات کے بعد کیرالا میں اُردو کو فروغ پانے کے لیے کئی سال لگ گئے۔ اُردو کے لیے حالات سازگار ہونے پر ۸ ستمبر ۱۹۹۱ء میں کالی کٹ کے بیاپارا بھون میں منعقدہ محبانِ اُردو کے اجلاس میں 'انجمن ترقی اُردو' کیرالا شاخ از سرِ نو تشکیل دی گئی۔ صدر کی حیثیت سے ماہرِ اقبالیات اُردو کے مبلغ شہرت یافتہ شعلہ بیان مقرر و عالم جناب ایم۔پی۔عبد الصمد صمدانی صاحب کو چن لیا گیا۔ انجمن ترقی اُردو کیرالا اس وقت اُردو کے لیے بے لوث خدمات انجام دے رہی ہے۔ ہر دو سال میں ریاستی کانفرنس کے ساتھ ساتھ مختلف موضوعات پر سیمنار، مشاعرے اور شامِ غزل جیسے پروگرام بھی منعقد کر کے عام لوگوں کو اُردو کی طرف راغب کر رہی ہے۔ اس وقت انجمن کے سکریٹری ڈاکٹر پی۔کے۔عبد الحمید کاراشیری صاحب ہیں جو بہت ہی خوبی کے ساتھ اپنی ذمہ

داری نبھار ہے ہیں۔

'کیرالا اُردو ٹیچرس ایسوسیشن' اُردو کی ترقی اور ترویج کے لیے زبردست جدوجہد کرنے والی ایک انجمن ہے۔ یہ انجمن اُردو اساتذہ پر مشتمل ہے۔ ۱۶؍فروری ۱۹۷۴ء کو قائم کردہ یہ انجمن شروع سے اب تک اُردو کی بے لوث خدمات انجام دے رہی ہے۔ اٹھارہ سال کے طویل عرصہ تک کے۔ یو۔ ٹی۔ اے۔ کے صدر کی حیثیت سے خدمات انجام دینے والے محترم پی۔ محی الدین گٹی صاحب اپنے تن من دھن اور خون پسینے سے اس انجمن کو سینچا اور کیرالا میں اُردو کو ایک ایسے مقام تک پہنچایا جہاں سے اُردو کی ترقی کے لیے راستے ہموار ہوگئے۔ اپنی سبکدوشی کے بعد سے اب تک بھی وہ اُردو کی خدمت کررہے ہیں۔ فی الوقت پی۔ محی الدین گٹی صاحب 'ریٹائرڈ اُردو ٹیچرس فیڈریشن' کے صدر نشین اور 'انجمن ترقی اُردو کیرالا' کے خازن ہیں۔

کیرالا میں ۱۹۳۰ء کے بعد سے مختلف انجمنوں اور اداروں کی جانب سے اُردو قلمی جریدے شائع ہونے لگے تھے۔ اس سلسلے میں کیرالا کے تاریخی شہر تلاشیری میں اپریل ۱۹۳۸ء میں 'نارجیلستان' کے نام سے ایک رسالہ شائع ہوکر منظر عام پر آیا جو کیرالا کا سب سے پہلا اُردو رسالہ تھا۔ یہ رسالہ انجمن اصلاح اللسان کی نگرانی میں شائع ہوتا تھا، لیکن افسوس کہ چند شماروں کے بعد یہ بند ہوگیا۔ کئی سالوں کے بعد یعنی اگست ۱۹۸۸ء کو تلاشیری میں چند محبان اُردو نے پھر سے اس کو زندہ کیا۔ کیرالا میں اُردو ٹیچرس ایسوسیشن (کے۔ یو۔ ٹی۔ اے۔) کے نام سے جو انجمن ہے اس کے ماتحت 'اُردو بلیٹن' کے نام سے ایک سہ ماہی رسالہ نکلتا ہے۔ جو آج بھی باقاعدہ طور پر اچھے اچھے معیاری مضامین کے ساتھ جاری ہے۔ اسی طرح کیرالا میں فروغ اردو زبان و ادب کے تعلق سے شہر کالی کٹ چینا منگلور میں ''اردو پر چار سمیتی'' کے نام سے قائم کردہ ایک اور انجمن کی طرف سے بھی جنوری ۱۹۹۳ء سے 'ملباری آواز' کے نام سے ایک پندرہ روزہ اُردو رسالہ

'کیرالا اُردو ٹیچرس ایسوسیشن' اُردو کی ترقی اور ترویج کے لیے زبردست جدوجہد کرنے والی ایک انجمن ہے۔ یہ انجمن اُردو اساتذہ پر مشتمل ہے۔ ۱۶؍فروری ۱۹۷۴ء کو قائم کردہ یہ انجمن شروع سے اب تک اُردو کی بے لوث خدمات انجام دے رہی ہے۔ اٹھارہ سال کے طویل عرصہ تک کے۔ یو۔ ٹی۔ اے۔ کے صدر کی حیثیت سے خدمات انجام دینے والے محترم پی۔ محی الدین گٹی صاحب اپنے تن من دھن اور خون پسینے سے اس انجمن کو سینچا اور کیرالا میں اُردو کو ایک ایسے مقام تک پہنچایا جہاں سے اُردو کی ترقی کے لیے راستے ہموار ہوگئے۔ اپنی سبکدوشی کے بعد سے اب تک بھی وہ اُردو کی خدمت کررہے ہیں۔

نکلتا تھا۔ لیکن افسوس کہ چند شماروں کے بعد یہ بھی بند ہوگیا۔

اسی طرح ضلع ملاپرم کے مکرا پرامبہ گاؤں سے جولائی ۲۰۱۰ء سے بچوں کے لیے 'جھلک' کے نام سے ایک ماہنامہ شائع ہونے لگا۔ ضلع ملاپرم کے ہی ایک مشہور تاریخی شہر چیماڈ میں موجود عالمی شہرت یافتہ دارالہدیٰ اسلامک یونیورسٹی کی جانب سے 'پیامِ ہدیٰ' کے نام سے ایک ماہنامہ جاری ہورہا ہے۔ اس کے علاوہ کیرالا کے مشہور تاریخی شہر کالی کٹ میں واقع عالمی شہرت یافتہ اسلامی ادارہ مرکز الثقافت السنّیہ کی جانب سے بھی اُردو میں ایک ماہنامہ 'تعلیمی دنیا' کے نام سے نکل رہا ہے اور سارے ہندوستان میں اس کے خریدار بھی ہیں۔ اسی طرح ضلع ملاپرم کے ایک شہر پرنتھل منّا کے شانتاپورم میں واقع الجامعہ اسلامیہ یونیورسٹی، ضلعہ ملاپرم کے تاریخی شہر ایڈاوناّ میں واقع جامعہ ندویہ، ضلع ملاپرم کے مشہور شہر منجیری میں واقع ویٹے کاڈ اسلامیہ کالج اور اسی طرح کیرالا میں واقع مختلف دینی درس گاہوں سے بھی اُردو میں رسائل اور جریدے شائع ہوکر منظر عام پر آتے ہی رہتے ہیں۔

زمانہ حال میں کیرالا میں اسکولی سطح پر اُردو کی ترقی وترویج خوب سے خوب تر ہورہی ہے۔ اسکولی سطح پر سرکار کے تعاون سے منعقد کیے جانے والے کلوتسو (یوتھ فیسٹول) ایشیا کا سب سے بڑا اسکول یوتھ فیسٹول مانا جاتا ہے۔ اس میں اسکول کے ہونہار طلبا تقریباً سارے فنون کا بہت ہی خوبی کے ساتھ مظاہرہ کرتے ہیں۔ اِن مقابلہ جاتی فنون میں اُردو کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ شروع شروع میں اس فنکاری میلہ میں اُردو کے تعلق سے صرف اُردو نظم خوانی کا مقابلہ ہی ہوا کرتا تھا۔ لیکن گزشتہ متحدہ جمہوری محاذ حکومت نے اس کلوتسو میں اُردو نظم خوانی کے ساتھ ساتھ غزل گوئی، گروپ سونگ، کوئیز، افسانہ نگاری، شاعری جیسے ادبی مقابلے بھی شامل کیے ہیں۔ جن میں اُردو طلبا بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں اور اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ غزل گوئی کے لیے کیرالا بہت مشہور ہو چکا ہے۔ ہر خاص

وعام غزل کے شیدائی ہیں جو اُردو نہیں جانتے وہ بھی۔

کیرالا کے سرکاری اسکولوں میں دسویں جماعت میں اُردو اختیاری مضمون کے ساتھ بقیہ تمام مضامین میں اے۔پلس (A+) حاصل کرکے کامیاب ہونے والے طلبا کو سرکار کی جانب سے ہزار روپے کا نقد انعام کے ساتھ ساتھ سند بھی دی جاتی ہے۔اب سرکار نے اسے بڑھا کر بارہویں جماعت تک کر دی گئی ہے۔ حکومت کیرالا کے ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ کے ماتحت بنائی جانے والی اسٹیٹ کری کلم اسٹیرنگ کمیٹی (کیرالا) میں اور اسٹیٹ کوالٹی امپرومنٹ پروگرام (کیرالا) میں بھی اُردو کی نمائندگی ہو رہی ہے۔ بہرحال سرکاری سطح پر اُردو کو وہ سب کچھ مل رہی ہے جو دوسری ریاستوں میں نہیں مل پا رہی ہے۔

۲۰/اپریل ۲۰۰۳ء کو کیرالا کے کالی کٹ میں علامہ اقبال کی عظیم یادگار کے طور پر 'علامہ اقبال انڈین ہیومینیٹیرین اکیڈمی' بھی قائم کی گئی ہے۔ اس اکیڈمی کے ڈائریکٹر جناب ایم پی عبد الصمد صمدانی صاحب ہیں۔ یہاں پر بھی مختلف موضوعات پر اُردو میں سیمنار اور دیگر تقریبات منعقد کیے جاتے ہیں۔ شمس الرحمن فاروقی، گوپی چند نارنگ، کلدیپ نیّر جیسے عظیم شخصیات یہاں تشریف لا چکے ہیں۔ کیرالا میں اقبالیات کے فروغ میں صمدانی صاحب نے اہم رول ادا کیا ہے۔ اقبالیات پر کئی ایک کتابیں بھی شائع کیں ہیں۔ کیرالا میں غالبیات بھی فروغ پا رہی ہے۔ ملیالم میں غالبیات پر بھی کئی کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔

کیرالا میں محبانِ اُردو کے لیے اُردو اساتذہ 'کیرالا اُردو سینٹر' کے نام سے عظیم الشان عمارت تعمیر کرنے کا ارادہ کرلیا ہے۔ اس کے لیے اُردو اساتذہ کے ذاتی رقم سے کالی کٹ میں پلاٹ بھی خرید لیا گیا ہے۔ 'کیرالا اُردو سینٹر' کے معتمد عمومی جناب کلّیت عبدالرحمن کُٹی صاحب، کنسٹرکشن کمیٹی کے چیرمین ٹی۔محمد صاحب اس سلسلے میں اپنی ذمہ داری بہ خوبی انجام دے رہے ہیں۔ کیرالا اُردو ٹیچرس ایسوسیشن کے سابق جنرل سیکریٹری مرحوم کلاتھل احمد کٹی صاحب اور انجمن ترقی اُردو کیرالا کے سابق جنرل سیکریٹری مرحوم ڈاکٹر کے۔عبدالغفور صاحب کیرالا اُردو سینٹر کے لیے بے لوث خدمات انجام دیے ہیں۔ اس وقت 'کیرالا اُردو ٹیچرس ایسوسیشن' کے اس پلاٹ پر اُردو اساتذہ اپنے ذاتی خرچ پر عمارت کا تعمیری کام شروع ہو چکا ہے۔ کیرالا اُردو ٹیچرس ایسوسیشن کے صدر نشین جناب ایم۔حُسین اور سیکریٹری وی۔وی۔ایم۔ بشیر صاحب اور دوسرے اراکین اس عملی کام میں پیش پیش ہیں۔

> ۲۰/اپریل ۲۰۰۳ء کو کیرالا کے کالی کٹ میں علامہ اقبال کی عظیم یادگار کے طور پر 'علامہ اقبال انڈین ہیومینیٹیرین اکیڈمی' بھی قائم کی گئی ہے۔ اس اکیڈمی کے ڈائریکٹر جناب ایم پی عبد الصمد صمدانی صاحب ہیں۔ یہاں پر بھی مختلف موضوعات پر اُردو میں سیمنار اور دیگر تقریبات منعقد کیے جاتے ہیں۔ شمس الرحمن فاروقی، گوپی چند نارنگ، کلدیپ نیّر جیسے عظیم شخصیات یہاں تشریف لا چکے ہیں۔ کیرالا میں اقبالیات کے فروغ میں صمدانی صاحب نے اہم رول ادا کیا ہے۔ اقبالیات پر کئی ایک کتابیں بھی شائع کیں ہیں۔ کیرالا میں غالبیات بھی فروغ پا رہی ہے۔ ملیالم میں غالبیات پر بھی کئی کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔

اُردو زبان کی پاسبانی میں حکومتِ کیرالا پیش پیش ہے۔ بھلے ہی اقتدار میں کوئی بھی آئے۔ کیرالا میں متحدہ جمہوری محاذ کے دور میں 'کیرالا اُردو اکادمی' قائم کرنے کی تجویز پیش کی گئی اور ۲۱/جنوری ۲۰۱۶ء میں 'کیرالا اُردو اکادمی' قائم کرنے کا اعلان کرتے ہوئے سرکاری فرمان بھی جاری کیا گیا۔ بجٹ میں اس کے لیے بڑی رقم بھی مختص کر دی گئی۔ اکتیس ارکان پر مشتمل کیرالا اُردو اکادمی اس وقت طفلِ شیر خوار ہے۔

صدرِ جمہوریہ ہند کے دستِ مبارک سے عطا کیے جانے والے بہترین معلم کا قومی ایوارڈ پانے والوں کی فہرست میں بھی کیرالا کے اُردو اساتذہ کے نام بھی آچکے ہیں۔ اب تک تین اُردو اساتذہ قومی ایوارڈ حاصل کر چکے ہیں۔ کونڈوٹی کے شاہ صاحب، تاڑے کوڈ کے عبدالرحمن صاحب اور کالی کٹ کے ڈاکٹر حمید کارشیری صاحب یہ قومی ایوارڈ حاصل کر چکے ہیں۔

کیرالا والوں کو یہ زبان کوئی وراثت یا مفت میں ملی ہوئی زبان نہیں ہے، بلکہ یہ کیرالا والوں کی محنت کی گاڑھی کمائی ہے۔ اس لیے کیرالا کے لوگ کسی بھی حالت میں اس کو نقصان ہونے نہیں دیں گے۔ اس کے تشخص کو برقرار رکھنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرتے رہیں گے۔ کیرالا کے محبانِ اُردو خدا تعالی سے دعا گو ہیں کہ اس عزم کو قبول فرمائے اور اس شیریں زبان کو نظر بد سے بچائے۔ آمین

❑❑❑

اردو شعر و ادب میں ندؔا فاضلی کی امتیازی حیثیت



عرفان اللہ خاں

ریسرچ اسکالر

گورنمنٹ مادھو پی جی کالج

وکرم یونیورسٹی، اجین (ایم پی)

رابطہ: 7581965756

عہد حاضر کے شعر و ادب میں ندؔا فاضلی کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ انہوں نے سبھی مروجہ اصناف ادب میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے تخلیقی کارنامے لازوال اور بے مثال ہیں۔ ان کی ادبی شخصیت مستند اور مسلم ہے۔ انہوں نے اپنے سوانحی ناول دیواروں کے بیچ اور دیواروں کے باہر میں منصفانہ طور پر اپنے کنبہ کا ذکر کیا ہے۔ عموماً شعراء و اُدبا کنبہ کی خامیوں کو بہت کم ہی اپنی تحریر کا حصہ بناتے ہیں۔ اس کے برعکس ندؔا فاضلی اپنے کنبہ اور دوستوں وغیرہ کا ذکر بڑے ہی دلچسپ انداز میں کرتے نظر آتے ہیں۔ والد کے بارے میں کھل کر بات کرتے ہیں۔ دیواروں کے بیچ میں وہ ایک جگہ اپنے والد کے تعلق سے رقم طراز ہیں:

'گھر میں اچھی شکل وصورت کی بیوی ہے اور ساتھ میں سندھیا در بار کی ایک مغنیہ کی زلف کے اسیر بھی ہیں۔ اس مغنیہ کا نام زیب النساء ہے۔ ریڈیو سے بھی کلاسیکی میوزک کے پروگرام دیتی ہیں۔ بچہ کوئی نہیں ہے مرتضیٰ حسن کے بچوں کو جہاں دیکھ لیتی ہیں ٹوٹ کے پیار کرتی ہیں، بلائیں لیتی ہیں، پیسے دیتی ہیں، لیکن ان سب کے باوجود بچوں کو وہ پسند نہیں ہیں۔'

(دیواروں کے بیچ، ندا فاضلی، ص نمبر ۱۰-۱۱)

انہوں نے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز منفرد انداز میں غزل سے کیا۔ مثلاً انہوں نے ایک غزل کہی:

سورج کو چونچ میں لئے مرغا کھڑا رہا
کھڑکی کے پردے کھینچ دئے رات ہوگئی

یہ اب تک کی غزل کا منفرد شعر ہے۔ اس شعر پر اس وقت کے ادیبوں و شاعروں میں خوب مباحثے ہوئے۔ لیکن قارئین نے اس شعر کی خوب پذیرائی کی۔ اس طرح کے بے شمار اشعار کہہ کر ندؔا فاضلی نے اردو غزل کو توانگر اور توانا بنایا۔ انہوں نے ایک طرف میر تقی میرؔ، غالب اور دردؔ کا مطالعہ کیا تو دوسری جانب کبیر، تلسی، میرا بائی کی تخلیقات کا بھی خوب مطالعہ کیا اس وجہ سے ان کے ذہن میں وسعت پیدا ہوگئی۔ ان کی شاعری کو ہندی اور اردو کا پُل کہا جاتا ہے۔

ان کی شاعری میں ہندی اور اردو گلے ملتے نظر آتے ہیں۔

ندا فاضلی نے شاعری میں کل چھ مجموعات تخلیق کئے ہیں۔جن میں لفظوں کا پُل (1971)،مورناچ(1978) آنکھ اور خواب کے درمیان (1984)، کھویا ہوا سا کچھ (1996)،شہر تو میرے ساتھ چل 2004) ،زندگی کی تڑپ کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ان کے تمام شعری مجموعوں میں غزلیں، نظمیں، گیت ،دوہے، ماہیے وغیرہ شامل ہیں۔ ندا فاضلی کی نظم نگاری نہ صرف موضوعاتی سطح پر بلکہ فنی اعتبار سے اپنے عہد کی ایک زندہ جاوید آواز بن کر ان کے کام کو دوام بخشتی ہے۔غزل کے بعد نظم وہ واحد صنف سخن ہے جس میں ندا فاضلی نے قابل قدر پیش رفت کی ہے اور نظم کی صنف کو معتبر بنایا ہے۔تقسیم ہند کے بعد ان کا کنبہ پاکستان ہجرت کر گیا لیکن ندا فاضلی ہجرت کے سخت مخالف تھے ان کا ماننا تھا کہ زمین کی تبدیلی کسی مسئلہ کا حل نہیں اس لئے انہوں نے اپنے کنبہ بالخصوص والدین کے اصرار کے باوجود ہندستان میں ہی رہنے کو ترجیح دی اور تادم مرگ ہندستان میں ہی رہے۔تقسیم ہند کے بعد برپا ہوئے فسادات میں فسادیوں نے ان کے گھر کو جلا دیا اور ان کے کنبہ کو دوسری جگہ پناہ لینی پڑی۔وہ گھر سے کئی بار بے گھر ہوئے۔اس لئے انہوں نے گھر کو علامت بنا کر بہت سی نظمیں کہی ہیں جن میں اپنا گھر، گھر سے، نئے گھر کی پہلی نظم وغیرہ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ان کی نظموں میں ان کے گھر سے بے گھر ہونے کا کرب صاف طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔

انہوں نے ہندو مسلم فرقہ وارانہ تشدد کا ذمہ دار کافی حد تک سیاسی لیڈران کو ٹھہرایا۔اس حساس موضوع پر انہوں نے ایک غزل بعنوان ایودھیا اور ایک نظم ایک قومی رہنما کے نام لکھی۔ اس نظم میں

ندا فاضلی نے سیاست کو تجارت بتایا ہے۔یہ نظم عصر حاضر کی عکاسی کرتی ہے۔اس طرح انہوں نے ایک اور نظم ہجرت کے موضوع پر لکھی اس میں ہجرت کے دوران ہوئی تکالیف کو بیان کیا گیا ہے اور انہوں نے اس میں بتایا ہے کہ ہجرت میں انسانوں کو بہت کچھ کھونا پڑتا ہے۔اسی طرح انہوں نے دیگر موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں۔زندگی کا کوئی گوشہ نہیں ہوگا جو ندا فاضلی سے چھوٹ گیا ہو۔انہوں نے اپنی نظموں کے ذریعہ آدمی کو انسان بننے کی صلاح دی ہے۔

ندا فاضلی ایسے گیت نگار ہیں جنہوں نے اس قدیم صنف کو نہ صرف زندہ رکھا بلکہ اس میں ایک نیا رنگ بھرنے کی کوشش کی اور اس میں وہ کافی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔چونکہ گیت ہندی ادب سے اردو میں آئی اس لئے اس کی نازک مزاجی کو ندا فاضلی نے کبھی اپنے ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا۔ایک کامیاب اور مکمل گیت نگار کیلئے حرف شناس ہونا ضروری ہے۔ندا فاضلی بلا شبہ ایک کامیاب گیت نگار کے ساتھ ساتھ فطری گیت نگار ہیں اور اس صنف کی گہرائیوں میں اتر کر انہوں نے اپنے گیتوں کے مختلف راگوں اور موضوعات کا انتخاب کیا ہے۔انہوں نے ایسے گیت تخلیق کئے ہیں جس نے عوام کے دلوں میں ایک نئی امنگ جگا دی۔گیت نگاری کے معاملہ میں ندا فاضلی کا یہ اجتہاد اردو ادب کی تاریخ کا ایک غیر اہم موڑ ہے۔چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ گیت نگاری ندا فاضلی کی شخصیت اور ان کی پہچان بن گئی۔

دوہا بھی ہندی شاعری کی مرہون منت ہے۔اس صنف میں بھی غزل کی طرح دو مصرعوں میں اپنی بات مکمل کرنی ہوتی ہے۔دوہا عوام الناس کی آواز مانا جاتا ہے اس لئے دوہے سے قاری براہ راست وابستہ ہو جاتا ہے۔ ندا فاضلی کے دوہوں کی تعداد کچھ کم ہے لیکن انھوں نے جو بھی دوہے لکھے وہ ضرب المثل کی حیثیت رکھتے ہیں مثلاً:

سیدھا سادھا ڈاکیہ جادو کرے مہان
ایک ہی تھیلے میں بھرے آنسو اور مسکان

دوہا ہمیشہ سے سماجی مسائل کو پیش کرتا رہا ہے۔اس میں شاعر روزمرہ کے مسائل کو کچھ اس طرح بیان کرتا ہے کہ اس میں تازگی اور انوکھا پن پیدا ہو جاتا ہے۔ندا فاضلی کو اپنے زمانے کے حالات اور اس کی کربناکی کا ادراک تھا وہ اپنے دوہوں میں انسانی معاشرتی مسائل کو پیش کرتے ہوئے کھردرے الفاظ کو بھی رچاؤ اور خوش سلیقگی کے ساتھ نظم کرتے ہیں مثلاً:

ساتو دن بھگوان کے کیا منگل کیا پیر
جس دن سوئے دیر تک بھوکا رہے فقیر

وہ صوفی کا گیان ہو یا پنڈت کا گیان
جتنی بیتے آپ پر ،اتنا ہی سچ مان

اندر مورت پر چھڑے، گھی ،پوری، لوبان
مندر کے باہر کھڑا ایشور مانگے دان

نقشہ لے کر ہاتھ میں ،بچہ ہے حیران
کیسے دیمک کھا گئی اس کا ہندستان

بچہ بولا دیکھ کر مسجد عالیشان
اللہ تیرے ایک کو اتنا بڑا مکان

انھوں نے اپنے دوہوں میں ہندی الفاظ کا استعمال اس قدر برمحل کیا ہے کہ اس میں

ایک نئی جدت پیدا ہوگئی:

چاہے گیتا بانچئے یا پڑھئے قرآن
میرا تیرا پیار ہی ہر پستک کا گیان

ندا فاضلی کو ہندی اور اردو زبان پر عبور حاصل تھا اس لئے انہوں نے ہندی اور اردو الفاظ کا استعمال برمحل کیا ہے۔

میں رویا پردیس میں بھیگا ماں کا پیار
دکھ نے دکھ سے بات کی بن چٹھی بن تار

ندا فاضلی کی فلمی شاعری کافی مقبول و مشہور ہے۔اردو کے بغیر ہندستانی فلم کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی ہے۔ درحقیقت اردو کے استعمال کے بغیر کامیاب فلم کا تصور ممکن نہیں ہے۔ جب بھی فلموں کے مقالے اور کہانیاں ،نغمہ وغیرہ تحریر کئے گئے تو اردو کو ہی برتری حاصل رہی۔ندا فاضلی اپنی فلمی نغموں کی وجہ سے ہمیشہ یاد کئے جائیں گے۔

ندا فاضلی نے جب ممبئی کا رخ کیا تو ابتدائی ایام میں انہوں نے بہت ہی عسرت ،تنگ دستی ،کسمپرسی کی زندگی گذاری۔ان دنوں وہ ہندی میگزین دھرم یگ اور انگریزی، ہندی، اردو اخبار بلٹز کیلئے کام کرتے تھے اور اخبار کے دفتر میں ہی اخبار بچھا کر سوجاتے تھے۔اس کے علاوہ وہ بی بی سی ہندی میں انداز بیاں کے نام سے کالم لکھا کرتے تھے۔رفتہ رفتہ جب ان کے کلام ادبی رسائل اور اخبارات میں شائع ہونے لگے تو ندا فاضلی کی شہرت میں اضافہ ہوا اور ان کی شہرت میں اس وقت چار چاند لگ گئے جب ان کی غزل دنیا جسے کہتے ہیں جادو کا کھلونا ہے، مل جائے تو مٹی ہے کھو جائے تو سونا ہے کو مایہ ناز گلوکار جگجیت سنگھ اور ان کی شریک حیات چترا نے اپنی خوبصورت آواز میں عوام تک پہنچائی۔اسی دوران فلم رضیہ سلطان کے نغمہ نگار جاں نثار اختر کا انتقال ہوگیا۔اس فلم کے ہدایت کار کمال امروہی تھے۔ندا فاضلی کی ادبی صلاحیتوں سے متاثر ہوکر انہوں نے ان سے رابطہ کیا اور فلم کے باقی نغمہ لکھنے کی ذمہ داری سونپی اور ساتھ میں ہدایت دی کہ موسیقار خیام کے ساتھ مل کر ایسا نغمہ رقم کیجئے جو فلم کی شایان شان کو دوبالا کردے۔اس فلم کیلئے ندا فاضلی نے دو نغمہ تخلیق کئے آئی زنجیر کی جھنکار خدا خیر کرے اور تیرا ہجر ہی میرا نصیب ہے لکھے۔اس فلم میں ہیما مالنی اور دھرمیندر نے اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے۔اس فلم کی کامیابی کے بعد ندا فاضلی نے ایک کے بعد دیگرے کامیابی کی منزلیں طے کی۔انھوں نے فلم آہستہ آہستہ (تو اس طرح سے میری زندگی میں شامل ہے، جہاں بھی جاؤں یہ لگتا ہے تیری محفل ہے)،سرفروش،اس رات کی صبح نہیں، ناخدا، آپ تو ایسے نہ تھے، یاترا، سُر وغیرہ کیلئے عمدہ نغمہ لکھے۔فلم آہستہ آہستہ کا نغمہ شہرت کی اس منزل تک پہنچا کہ فلم کی مقبولیت کا سبب بن گیا۔اس فلم کے موسیقار خیام تھے اور مشہور گلوکار آشا بھوسلے اور پھوپندر سنگھ نے اپنی مترنم آواز سے نغمہ کو دلکشی بخشی جو فلمی ہدایت کے ساتھ ساتھ ادبی تقاضوں پر پورا اترتا ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے ٹی وی سیریل سیلاب کیلئے ٹائٹل گیت لکھے۔اسی طرح فلم سرفروش کا نغمہ ہوش والوں کو خبر کیا بے خودی کیا چیز ہے کو جگجیت سنگھ نے اپنی آواز دی اور اس غزل نے بھی لازوال شہرت حاصل کی اور عامر خان ،نصیر الدین شاہ ،اور سونالی بیندرے نے اس فلم میں اداکاری کی۔اشعار ملاحظہ ہوں:

ہوش والوں کو خبر کیا بے خودی کیا چیز ہے
عشق کیجئے پھر سمجھئے زندگی کیا چیز ہے
اُن سے نظریں کیا ملیں روشن فضائیں ہوگئیں
آج جانا پیار کی جادو گری کیا چیز ہے
بکھری زُلفوں نے سکھائی موسموں کو شاعری
جُھکتی آنکھوں نے بتایا مے کشی کیا چیز ہے
ہم لبوں سے کہہ نہ پائے اُن سے حال دل کبھی
اور وہ سمجھے نہیں یہ خامشی کیا چیز ہے

ندا فاضلی نے ادبی معیاری فلمی نغمہ لکھے ان لازوال شہرت یافتہ فلمی نغموں سے قطع نظر ندا فاضلی نے ندفلمیں بھی لکھیں جن میں وجئے ، ہر جائی اور فلک کے نام قابل ذکر ہیں۔

ندا فاضلی کی فلموں کی دنیا میں انٹری ایک اتفاق تھی۔انہوں نے اس موقع کا استعمال اتنا اچھا کیا کہ ایک دور ایسا بھی آیا کہ ان لے لکھے نغمہ فلم کی کامیابی کے ضامن بننے لگے۔ندا فاضلی کی شاعری میں کہیں بھی پیچیدگی یا الجھاؤ کا احساس نہیں ہوتا۔انہوں نے جن مسائل یا موضوعات کو اپنی شاعری کا محور بنایا دوسرے معاصرین شعراء میں خال خال ہی نظر آتا ہے۔انہوں نے دو حاضر کے حقائق کو اپنی شاعری کا ترجمان بنایا جسے ہر شخص اپنی زندگی کا حصہ سمجھتا ہے۔ندا فاضلی کی نثری خدمات سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ان کی تخلیقات ملاقاتیں (تنقیدی مضامین 1986)، دیواروں کے بیچ (سوانحی ناول)، دیواروں کے باہر (2000)، چہرے (مشاعرے کے شاعروں کے خاکے (2003) کی بڑی قدر و قیمت ہے۔

انسانیت کے وقار اور سربلندی کو ہمیشہ پیش نظر رکھتے ہوئے حق و صداقت کی حمایت ندا فاضلی کی فطرت تھی۔اپنے تجربات کو انہوں نے جس بے باکی سے اظہار کیا وہ ان کی امتیازی خصوصیت ہے۔اپنے افکار تازہ سے وہ جہان تازہ کی جانب ہمیشہ گامزن رہے۔انہوں نے

اپنے منفرد اسلوب سے اردو زبان و ادب میں ایک امتیازی حیثیت حاصل کی۔

ندآ فاضلی کی تصنیف دیواروں کے بیچ سوانحی ناول سب سے پہلے ادبی مجلّے شاعر میں قسط وار شائع ہوا۔اس کے بعد سنہ 1992 میں کتابی شکل میں منظر عام پر آیا تو اس کی ادبی و علمی و ادبی حلقوں نے خوب پذیرائی کی۔قارئین نے اس میں خوب دلچسپی دکھائی۔ندآ فاضلی کی تصانیف دیوارو ں کے بیچ اور دیواروں کے باہر کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ ان میں مرکزی کردار خود ندآ فاضلی ہیں۔ان کی ذات کے تمام اہم واقعات ارد گرد گردش کرتے ہیں۔

ملاقاتیں ندآ فاضلی کی نثر نگاری کا نادر نمونہ ہے۔اس تصنیف سے انھوں نے اردو ادب کے قاری کو ایک نئی اسلوب نگارش اور انداز بیان سے آشنا کیا۔ ملاقاتیں 1986ء مین زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آئی۔اس تصنیف میں ندآ فاضلی نے اہم شخصیات کے انٹرویو منفرد بے باک اور بے خوف انداز میں قلم بند کیا ہے۔انہوں نے کبھی زمانے کی پابندیوں رسم و رواج کی پرواہ نہیں کی۔ندآ فاضلی اپنی نوعیت کے انوکھے انسان اور ادیب تھے۔اسی طرح ان کی تخلیقات بھی انوکھی ہیں۔"ملاقاتیں" میں ندآ فاضلی نے اردو کے مشہور ادبا و شعراء فراق گورکھپوری، علی سردار جعفری، اختر الایمان، خواجہ احمد عباس، جاں نثار اختر، علی جواد زیدی، کیفی اعظمی، ساحر لدھیانوی، باقر مہدی اور قاضی سلیم کا خاکہ کھینچا ہے۔مذکورہ ادبی ہستیاں فلمی سطح پر بھی ندآ فاضلی سے منسلک رہی ہیں۔جس میں کچھ سے ان کی دلی انسیت تھی تو کچھ سے ان کا رشتہ تلخیوں بھرا تھا۔انھیں اپنی زندگی میں کسی نہ کسی موڑ پر ان شخصیات سے ذہنی سکون اور اضطراب دونوں ہی ملے اور بلا تفریق دوست و دشمن ان حضرات سے ہوئی ملاقاتوں کا عمدہ نقشہ اس تصنیف میں پیش کیا ہے۔علی سردار جعفری کے بارے میں ایک جگہ فرماتے ہیں:

'چمبور سے سیتامحل کا راستہ تو خیر اتنا اتنا طویل نہیں مگر ان کے کمرے سے ان تک پہنچنے کا راستہ اکثر بری طرح تھکا دیتا ہے۔ ترپن، چون سال لمبا راستہ-گھاٹیاں، پہاڑ، میدان، جنگیں، فسادات، انتخابات، جیل، انقلاب، محفلیں، سناٹے-بچے، بیوی، سماجی اقتدار.....اور نہ جانے کیا کیا..!...! مجھے لگتا ہے کہ خود سردار جعفری بھی اپنے آپ سے کم ہی مل پاتے ہوں گے۔'

(ملاقاتیں از ندا فاضلی ،ص نمبر،26)

ندآ فاضلی نظم نگاری، گیت نگاری، دوہا نگاری، ماہیا نگاری کے ساتھ ساتھ اپنی منفرد نثر نگاری کیلئے ادبی حلقہ میں جانے جاتے ہیں۔ان کا انداز بیان ایسا ہے کہ وہ خشک موضوع کو بھی دلکش انداز بیان سے قابل توجہ بنا دیتے ہیں۔ ملاقاتیں، دیواروں کے بیچ اور دیواروں کے باہر کے بعد ان کی چوتھی نثری کتاب چہرے 2002 میں منظر عام پر آئی۔جسے انھوں نے منفرد انداز میں لکھا ہے۔اس کتاب کے تمام مضامین کالم کی شکل میں سلسلہ وار روز نامہ انقلاب میں شائع ہو چکے ہیں۔انہوں نے اس کتاب میں ان شخصیات کا انتخاب کیا ہے جو اپنے وقت کے مشہور و معروف ہستیوں میں شمار کئے جاتے تھے۔اس میں زیادہ تر مشاعروں کے شاعروں کو جگہ دی گئی ہے۔اُس وقت مشاعروں اور اس کے آداب آج کے مشاعروں سے بالکل مختلف تھا۔اس دور میں مشاعرہ بازار و نہیں تھا۔اس کے برعکس آج کا حال یہ ہے کہ شعراء حضرات ایسے بھی ملیں گے کہ شاعری تو اردو میں کر رہے ہیں لیکن اردو رسم الخط سے نابلد ہیں۔آج تو لین دین کا معاملہ بھی خوب سر چڑھ کر بولتا ہے اور شاعر معاملہ کا لین دین کرنے کے بعد ہی مشاعرو ں کی محفل میں شریک ہوتے ہیں۔چہرے میں ندآ فاضلی نے ۲۳ شاعروں کا ذکر کیا ہے اس میں انہوں نے بالخصوص نوح ناروی، ناطق گلاوٹھی، نواب حکیم احمد، شکیل بدایونی، اسد بھوپالی، خمار بارہ بنکوی، شمیم فرحت وغیرہ کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔اس میں ان کا انداز بیان بالکل فطری ہے۔انہوں نے اپنی تمام تخلیقات میں پرشکوہ الفاظ کے استعمال سے گریز کیا ہے یہی وجہ کہ قاری ان کی تخلیقات میں زیادہ دلچسپی لیتا ہے۔چہرے میں ادبی ہستیوں کی تصویر کشی بڑی خوبصورتی سے ادبی پیرائے میں کی ہے لگتا ہے یہ تحریریں نہیں تصویریں ہیں۔علاوہ ازیں باتوں ہی باتوں میں تنقیدی، تہذیبی، معاشرتی اشارے جس منطقی انداز میں چابکدستی سے پیش کیا وہ ندآ فاضلی کی کمال ہنرمندی ہے۔سچ میں ایسی پختہ تحریریں بڑی دیر پا ہوتی ہیں۔غرض کہ عہد حاضر میں ندآ فاضلی کا شمار منفرد و ممتاز شعراء اور ادباء میں ہوتا ہے۔ ان کی تخلیقات باعث افتخار ہے جن میں عصری آگہی بدرجہ اتم ہے۔اپنے فکر و فن سے اردو شعرو ادب کو جلا بخشی ہے اس کی آب و تاب مستقبل میں بھی برقرار رہے گی۔لسانی اور فکری سطح پر ان کی امتیازی حیثیت ہمیشہ مسلم ہے۔زبان و بیان و اسلوب کے باب میں ان کی خدمات قابل ذکر ہی نہیں بلکہ قابل فخر بھی ہیں۔

❑❑❑

ناندیڑ کے بزرگ شاعر محترم راہیؔ صاحب!



اختر صادق

مکان نمبر۔۱
بلاک نمبر۔۷
لیبر کالونی ناندیڑ
رابطہ: 9673407199

محترم راہیؔ صاحب کو میں بچپن سے جانتا ہوں۔ وہ شہرِ ناندیڑ کے محلہ لیبر کالونی کے بلاک نمبر (۶) میں رہتے ہیں اور احقر بلاک نمبر (۷) میں۔ آپ کے بڑے فرزند ریاض احمد میرے بڑے بھائی سید محمد افسر علی (مرحوم) کے ہم جماعت ہیں تو ان سے چھوٹے فرزند اعجاز احمد میرے ہم جماعت۔ ہمارے اساتذہ کہا کرتے تھے کہ دسویں جماعت زندگی کا پہلا Turning point ہے۔ سو دسویں جماعت کے بعد ہمارے تعلیمی راستے الگ ہو گئے لیکن محترم راہیؔ صاحب سے ناتا نہیں ٹوٹا۔ آپ عمر کی ۸۷-۸۸ بہاریں دیکھ چکے ہیں لیکن آج بھی وہ ماشاءاللہ جوانوں کی سے چستی و پھرتی کے ساتھ ہر طلوع ہوتے سورج سے ہاتھ ملا کر کہتے ہیں:

میری منزلِ زیست ساحل نہیں ہے
میں راہیؔ ہوں منجدھار سے کھیلتا ہوں

بچپن کے راہیؔ صاحب اور آج کے راہیؔ صاحب کو دیکھیں سنیں تو شاید ہی کوئی فرق محسوس ہو۔ دبلے پتلے، دراز قد، وہی سراپا۔ عموماً سفید یا سرمئی نہرو شرٹ اور سفید پاجامہ زیب تن کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ کبھی کسی خاص موقع پر واسکوٹ بھی پہن لیتے ہیں۔ سر پر اونچی دیوار کی ٹوپی ہوتی ہے۔ پیر میں پُروقار جوتا یا چپل ہوتی۔ آج بھی تیز تیز قدموں سے چلتے ہیں۔ چلتے وقت خوبصورت عینک کے پیچھے سے وہ فقط آنکھ کی پتلیوں کی گردش سے گردشِ زمانہ کو دیکھتے اور آنکتے ہیں۔ عثمان شاہی مل میں ملازمت کے دوران کبھی کبھی سائیکل چلاتے ہوئے نظر آتے تھے۔ اپنا کام آپ کرتے ہیں۔ انسانیت کی فلاح و بہبود کے کاموں میں رات دن مصروف رہتے ہیں۔ چھوٹا ہو یا بڑا سب انہیں عموماً 'راہیؔ صاحب' کے نام سے ہی جانتے ہیں۔ نئے لوگ انہیں ''غفّار راہیؔ'' کے نام سے بلاتے ہیں۔ مجھے 'اختر' یا 'اختر میاں' کہتے اور ہم بڑے ادب سے انہیں سلام کرتے۔ مسکرا کر جب وہ جواب دیتے تو لگتا جیسے ہمیں ساری دنیا مل گئی ہو۔ آپ کا پورا نام 'محمد عبد الغفّار' اور تخلص 'راہیؔ' ہے۔ آپ نے جامعہ علی گڑھ سے ادیب، ادیب ماہر اور ادیب کامل کی تعلیم حاصل کی۔

ناندیڑ میں آپ کو ادارۂ ادبِ اسلامی ،مہاراشٹر کی جانب سے 2019ء میں ''حفیظ میرٹھی'' ایوارڈ سے نوازا جاچکا ہے۔اس سے قبل عظیم میوسیقار نوشاد کے ہاتھوں ناندیڑ بلدیہ عظمیٰ کی طرف سے آپ کی ناندیڑ کے بزرگ شاعر کی حیثیت سے عزّت افزائی کی گئی۔

مسجد کے معاملات ہوں یا جمعہ میں خطاب کرنا ہو آپ کو یاد کیا جاتا ہے۔آپ کا خطاب سیدھا سادا لیکن پُر اثر اور پُر درد ہوتا ہے۔محلہ اور شہر بھر کی معزّز اور اہم شخصیات نیز بزرگوں میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔کوئی تقریب ہو یا ادبی محفل آپ کے بنا ادھوری سمجھی جاتی ہے۔علاقہ مراٹھواڑہ سے لے کر مرکز دہلی تک آپ معروف ہیں۔

محترم راہیؔ صاحب ناندیڑ کے کہنہ مشق بزرگ شاعر ہیں۔ جب آپ غزل سرا ہوتے ہیں تو ''ہیں'' کی ''ی'' کو دبا کر پڑھتے ہیں۔سامعین آپ کی آواز کے سحر میں گرفتار ہوجاتے ہیں اور ایک خوبصورت سماں بندھ جاتا ہے۔آپ کی شاعری زمانے کے تلخ وشیریں تجربات کا نچوڑ ہے:

یہاں پر اجنبی کہتے ہیں مجھ کو اب وطن والے
بنایا ہے لہو سے اس کو دلکش گلستاں میں نے

+++

آج بھی گلیوں میں اٹھتا ہے دھواں
کل وہاں پر جانے کیا کیا جل گیا

آپ کا صبروضبط ،استقامت اور حالات سے سمجھوتا کرنے کا انداز اور فکر ی پرواز ملاحظہ فرمائیے:

راہیؔ لٹ کر بھی کہاں برباد ہوں میں
غم رہا باقی اثاثہ جل گیا

اورآپ کی خودداری اور احساسِ گریا کا یہ عالم بھی دیکھیے کہ

پلکوں سے گر کے بزم میں رسوا نہ کر مجھے
کرتا ہوں التجا یہی اشکِ رواں سے میں

ہر شخص کو اپنی مادری زبان سے محبت ہوتی ہے۔پھر اردو زبان تو ہے ہی محبت ویکجہتی کی زبان۔اس کی شیرینی ومعنی آفرینی کا تو ہر شخص گرویدہ ہے۔لیکن اردو سے بھید بھاؤ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ راہیؔ صاحب نے اس چیز کو محسوس کیا اور اپنے جذبات واحساسات کو بلاتکلف :اپنے اشعار میں ڈھالا۔آپ کے چند شعر ملاحظہ فرمائیے:

اسے ہندوستاں نے خون دل دے کر سنوارا ہے
علامت رنگِ یکجہتی کی ہے اردو زباں میری

+++

بہت ہی دلنشیں شیریں بیاں معلوم ہوتی ہے
محبت کی زباں اردو زباں معلوم ہوتی ہے

آپ کی شعری لفظیات بڑی معنی خیز ہیں۔جیسے 'تاریکی' ،'آندھی'، 'ہوا'، 'چراغ'، 'دیا'، 'نئے دیپ'، 'خار'، 'باغباں'، 'پاسباں'، 'نور' ،وغیرہ۔شاید ذیل کے شعر سے احقر کے خیال کی تائید ہوتی ہو:

کتنی سہمی ہوئی ہے تاریکی
آندھیوں میں دیا جلا ہوگا

آپ نے اپنی غزل کو تراکیب سے بھی سجایا ہے۔جیسے اشکِ رواں، دردِ جگر، نقیبِ گمرہی، چراغِ رہگزر، سوزِ غم، نخلِ تمنّا، نخلِ ارماں، چشمِ حیرت، گردشِ ایّام، دورِ جام، اسیرِ جام، جامِ عرفاں، دستِ الفت، دستِ افلاس، پیامِ بہاراں، خوابِ غفلت، خارِ نفرت، سازِ ہستی، دوشِ ہستی، گلشنِ زیست، زلفِ دوراں، دوستی کے پاؤں، غم کی دھوپ، ساغرِ مئے وحدت، مئے گسارانِ حرم، دشتِ طلب وغیرہ۔

محترم بزرگوار راہیؔ صاحب کی شاعری جس ڈھب کی ہے اس میں دنیا کے اہم واقعات، اسلامی تاریخ کے واقعات وغیرہ کا آنا فطری بات ہے۔لہٰذا آپ کی شاعری میں جا بجا تلمیحی اشارے بھی ملتے ہیں۔ یہ اشارے کہیں واضح ہیں تو کہیں کنایہ ہیں۔اس سے آپ کے مطالعہ اور حاصلِ مطالعہ کی فکری اساس معلوم ہوتی ہے۔ آپ ان واقعات کا انطباق عصرِ حاضر پر کرتے ہوئے ایک پیغام عمل بھی دیتے ہیں۔ چند ایک تلمیحی اشعار ملاحظہ فرمائیں:

رسمِ ابراہیمؑ کیوں باقی نہیں
آتشِ نمرود اب تو عام ہے

+++

آج فرعون ہوگیا زندہ
پھر عصائے کلیم لانا ہے

+++

یزیدِ وقت کھڑے ہیں لبِ فرات بہت
ہمارے ساتھ رہے گی یہ کربلا کب تک

تلمیحی اشارے کا ایک خوبصورت اور غضب کا شعر ملاحظہ فرمائیے:

چشمِ حیرت سے نیل تکتا رہا
پار کیسے اتر گئے ہیں لوگ

ایسا نہیں ہے کہ آپ کی غزل گوئی فقط اصلاحی، پیامی اور درس وعبرت اور سوز وگداز کے بیان سے لبریز ہے بلکہ اس میں رومانیت کی نزاکتوں کی پاکیزگی کو بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔مثال کے طور پر چند ایک شعر ملاحظہ فرمائیں:

اتفاقاً ملے وہ راہوں میں
کتنی باتیں ہوئیں نگاہوں میں

جب کبھی آپ یاد آئے ہیں
زخمِ دل خوب مسکرائے ہیں

تجنیس لاحق کا ایک شعر ملاحظہ فرمائیے:

تم ساتھ ہو تو راہیؔ نہیں کوئی مجھے غم
گرچہ رہِ منزل کوئی آساں تو نہیں ہے

اس شعر کے پہلے مصرعہ میں الفاظ ''تم'' اور ''غم'' میں ایک حرف ''ت'' اور ''غ'' کا فرق ہے۔ساتھ ہی ان کا تلفظ بھی جدا ہے۔اسی مضمون کا ایک دوسرا شعر نذرِ قارئین ہے:

بجھ چکے دیے سارے روشنی نہیں باقی
ساتھ تم نہیں ہو تو ہر طرف اندھیرا ہے

مختلف موضوعات پر بہت سے ہم مضمون اشعار قارئین کو آپ کے شعری مجموعہ ''دشتِ طلب'' میں مل جائیں گے۔جیسے بندگی، عزم، حوصلہ، کارواں، راہبر، رہنما، منزل کا راستہ، دوستی، وفا، نفرت، فرقہ پرستی، تعصب، میکدہ، ساقی، جام، دشمنی، علم، جہالت، اخلاق، کردار، چمن کی بربادی، امن، فتنے فساد، سازشیں، رنج وغم، گل، گلزار، خار، موج، ساحل، آندھی، طوفان وغیرہ۔لیکن یہ بھی ملحوظ رہے کہ

جانے کس سمت کھو گیا راہیؔ
چار سو ہم اسے پکار آئے

اور یہ شعر کہ جو آپ کے شعری مجموعہ کے نام ''دشتِ طلب'' کا ماخذ بھی ہے اور مجموعہ کے پشت پر آپ کی تصویر کے نیچے درج ہے:

کیا پتہ پوچھتے ہو راہیؔ کا
سوئے دشتِ طلب گیا ہوگا

راہیؔ صاحب کی طبیعت کی حقیقت پسندی اور انسانیت کو پیغامِ حق پہنچانے کی فکر و جستجو نے ہی شاید آپ سے ذیل کے اشعار کہلوائے ہیں:

دلوں کو جوڑنے نکلے ہو راہیؔ
دلوں کو جوڑنا آسان نہیں ہے

+++

نفرتوں سے زمین تپتی ہے
پیار کا مینہ خوب برساؤ

+++

تیرے ذمہ ہے دنیا کی قیادت
تیرے کردار پر سب کی نظر ہے

لیکن ذیل کا شعر نہ صرف شاعر کی فکر کا غماز ہے بلکہ اس توانائی کا مظہر بھی ہے جو کسی کام کو کرنے کے لیے ضروری ہے۔

تم ہی راہیؔ بڑھ کے اس کو روک دو
کارواں منزل سے ہے بھٹکا ہوا

محترم راہیؔ صاحب نے اپنے شعری سفر کا آغاز 1950ء سے کیا اور اپنی پہلی غزل کہی جس کا مطلع ہے:

راہِ حق میں جہاں بھی دار آئے
جان دینے کو جاں نثار آئے

یہ غزل آپ کے شعری مجموعہ کی پہلی ہی غزل ہے۔اس وقت آپ کی عمر یہی کوئی سولہ سترہ سال رہی ہوگی۔ملک کے دیگر گوں حالات میں اور اس عمر میں اس توانائی کا شعر کہنا یقیناً معمولی بات نہیں۔بقول آپ کے اس وقت ناندیڑ میں بہت سے ادبی حلقے تھے۔جیسے کھڑکپورہ، قدیم شہر، وزیرآباد اور مولوی الف الدین صاحب کا بنگلہ وغیرہ۔کھڑکپورہ کے ادبی حلقہ میں نیرؔ صاحب، رونقؔ اندوری، ممتازؔ نیرولی، مقبولؔ رتلامی، حبیب اختر اور مولوی حمید اللہ خاں وغیرہ شریک ہوا کرتے تھے۔قدیم شہر کے ادبی حلقہ میں مولوی اختر الزّماں ناصر، مولوی شیخ علی، حکیم خان حکیمؔ اورنگ آبادی اور مولانا محمد عمر صدیقی اطہر جالنوی جیسے ممتاز شعراء آیا کرتے تھے۔وزیرآباد ادبی حلقہ کے روحِ رواں محمود عشقی تھے۔اس حلقہ میں جناب حمید اختر، حمید اللہ خان حامدؔ اردھا پوری، شیخ محمد صہبا، میکش صحرائیؔ، عباس فراقی، چچا چاند، قمر اقبال، رفعت نواز، صابر صدیقی، عبدالقادر بیدلؔ، جمال علیمی، عبدالرحیم، عبدالرّحمٰن خوشترؔ، وغیرہ شریک ہوتے تھے۔قدیم شہر میں مولوی الف الدین صاحب کے بنگلہ پر مولانا اطہر جالنوی، مولوی اختر الزماں ناصر، حکیم خان حکیمؔ شمیم صاحب، نذیر اختر، عبدالقادر، نوراللہ خاں، عبدالقادر بیدلؔ، یونس فہمی، ساجد اسلم، فہیم احمد صدیقی وغیرہ کلام سناتے تھے۔لہٰذا آپ پر ناندیڑ کے ادبی ماحول کا اثر پڑا اور آپ نے ان اہلِ علم حضرات کی صحبتوں میں رہ کر اپنے شعری سفر کا آغاز کیا۔

الغرض محترم راہیؔ صاحب کی شاعری ایک سچے جذبے اور فکر و احساس کی شاعری ہے۔چونکہ آپ ایک زمانہ سے جماعتِ اسلامی سے وابستہ ہیں اس لیے آپ کی شاعری میں وسیع تجربات کے سرد و گرم کو جا بجا محسوس کیا جاسکتا ہے۔آپ کو دوسروں کا غم بھی اپنا غم محسوس ہوتا ہے۔اس لیے آپ کی شاعری شکوے شکایات سے دور ہے۔غیروں کو گلے سے لگانا، گرنے ہوؤں کو اٹھانا، ہر دم کارِ خیر کرتے رہنا، جہالت کو ختم کرنا، پیار و محبت سے نفرتوں کو ختم کرنا جیسے جذبات سے مملو یہ شاعری یقیناً کامیاب شاعری کہلائے گی؛ اور انسانیت یہ کہہ اٹھے گی کہ نفرت کی اندھی راہوں میں پیار و محبت کے دیپ جلانے والا ایک راہیؔ ایسا بھی ہے!

❑❑❑

محمد منظر الحق صدیقی کی شاعری

(نظر نظر منظر کے حوالے سے)

محمد منظر الحق صدیقی دربھنگہ کے ادبی محفلوں کا ایک نمایاں نام ہے جو بزم رہبر کے ایک فعال ترین شاعر ہیں۔ ویسے تو ان کا تعلق پیشہ کے اعتبار سے سلفیہ یونانی میڈیکل کالج لہیر یا سرائے دربھنگہ میں ہیڈ کلرک کی حیثیت سے ہے مگر ان کا دل ادب کی طرف مائل ہے۔ آپ کی پیدائش الحاج محمد منیف صاحب کے گھر ے ۱/اکتوبر ۱۹۶۰ء کو محلہ باقر گنج، لہیر یا سرائے دربھنگہ، بہار میں ہوئی تھی۔ ان کی تعلیم میٹرک، انٹرمیڈیٹ وغیرہ کے بعد ایم۔اے (اردو)، ایم اے (سوشیولوجی)، ایل ایل بی، بیچلر آف لائبریری سائنس (ایل این ایم یو) کو بھی حاصل کیا۔ ان کی یہ پہلی کتاب ہے جس کا نام ''نظر نظر منظر'' ہے جو غزلوں کا مجموعہ ہے۔ یہ کتاب ۲۰۱۹ء میں شائع ہوئی۔

منظر الحق منظر صاحب کی ایک اور کتاب ''زندگی کا سفر'' (افسانوں کا مجموعہ) زیر طباعت ہے۔ منظر الحق کا ادبی نام منظر صدیقی ہے۔ آپ کی ادبی سرگرمیاں اس طرح ہے کہ آپ بزم رہبر کے سکریٹری بھی ہیں اور صدر اردو فورم دربھنگہ کے ساتھ ہی آپ نائب صدر (سابق) حلقہ فکر وفن دربھنگہ کے ہیں۔

ان کو رکن انجمن ترقی اردو دربھنگہ اور ہندی ساہتیہ کے رکن ہندی سماہار منچ دربھنگہ کے جاں باز سپاہی ہیں۔ ان کی غزلوں کا پہلا مجموعہ ''نظر نظر منظر'' ہے۔ اس کتاب میں پانچ مضمون، ایک حمد پاک، دو نعت پاک اور ۱۲۴ غزلوں کو شامل کیا گیا ہے جو منفرد موضوع پر لکھی گئی ہے۔ کتاب کے آغاز میں انہوں نے اپنی بات کہی ہے جس میں تشکر کے الفاظ بیان کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ میں سب سے پہلا مضمون ''نئی جہت سے آشنا شاعر۔ منظر صدیقی'' کے نام سے سابق صدر شعبہ اردو دربھنگہ ہیں جو اس ناچیز کے پی ایچ۔ ڈی ورک کرانے میں استاد کی حیثیت سے نمایاں کردار ادا کیا۔ وہ ایک بڑے نقاد بھی ہیں۔ میری مراد پروفیسر رئیس انور رحمان صاحب سے ہے۔ استاد معزز نے منظر صدیقی کے بارے میں لکھا ہے ''ادبی ماحول اور بزرگوں کی صحت صالح کے نتیجے میں ان کا تخلیقی شعور پہلے صنف افسانے میں شعاع ریز ہوا۔



ڈاکٹر ریحان احمد قادری

کاشانۂ فیض، فیض روڈ

سرائے ستار خاں

دربھنگہ (بہار)

رابطہ: 9031201641

پھر شعر گوئی سے ایسی رغبت ہوئی کہ پچھلے ۳۵ برسوں سے مسلسل مشق سخن کر رہے ہیں۔ ابتدا میں انہوں نے مشہور ترقی پسند شاعر اویس احمد دوراں سے اصلاح لی اس کے بعد معروف استاد حضرت رہبر چندن پٹوی کے حلقہ تلامذہ میں شامل ہوگئے۔'' جناب منظر الحق صدیقی اپنے قلمی نام منظر صدیقی سے پہچانے جاتے ہیں۔ اس ادبی ماحول کے پروردہ اور متحرک رکن ہیں۔ منظر صدیقی نے کئی اصناف شاعری پر طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے حمد، نعت پاک، غزلیں اور نظمیں اخبارات و رسائل میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ اس کے علاوہ بعض کتابوں مثلاً لا الہ الا اللہ ۲۰۰۹، صل علی محمد مطبوعہ ۲۰۱۰ اور زم زم مطبوعہ ۲۰۱۹ میں بھی شامل ہیں۔ ان کے مجموعہ پر تذکرہ کرتے ہوئے ان کے مجموعہ کا شعر اس طرح رقم کرتے ہیں:

زمانے والے ہمیں اب مٹا نہیں سکتے
ہم ایسی آگ ہیں جس کو بجھا نہیں سکتے

شعر میں ایک تازہ کار خیال بڑے پرجوش انداز میں ابھرا ہے مگر اس کے بعد وہ خیال مخصوص طرز اظہار کے ساتھ کلاسیکی روایت میں گم ہوجاتا ہے۔ اس غزل کے دوسرے اشعار اور دوسرے غزلوں کے بیشتر اشعار کلاسیکی چھاؤں میں ابھرتے ڈوبتے نظر آتے ہیں دیکھئے اشعار:

یہ تشنہ کام، میں ساقی تو ان کو ساغر
پیئے بغیر محفل سے جا نہیں سکتے
رند ہیں پیتے ہیں ہم زاہد لیکن
تیرے ایمان کی طرح ڈگمگاتے تو نہیں

منظر صدیقی کی کائناب غزل روایت سے بہت متاثر ہے اور اس کا بنیادی اور حادی عنصر عشق ہے اس عشق میں ایک نوع کی محرومی، اداسی اور دل شکستگی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے کئی اچھے اشعار غزلیہ لے میں نکالے ہیں۔ دو اشعار ملاحظہ ہوں:

کل تک جو میرے واسطے رہتے تھے مضطرب
کرتے ہیں آج روٹھ کے وہ بات کس طرح
جب اپنے اختیار میں اک سانس بھی نہیں
لازم یہی ہے وعدۂ فردا نہ کیجئے

یہ کہنا مشکل ہے کہ عشقیہ خیالات محض کلاسیکی شاعری کے مطالعے کا عکس ہیں یا منظر صدیقی کی واردات قلب اور مرحلہ جاں کاہ کے ترجمان ہیں۔ اس طرح کے عمدہ خیالات کا اظہار ڈاکٹر رئیس انور رحمن نے ان کی شاعری کے اوپر کیا ہے جس کا میں نے ذکر کیا ہے۔

آگے جناب ذکی احمد نے منظر صدیقی کی نذر اکتوبر ۲۰۰۹ میں ان سے ملاقات کا ذکر کلام کی شکل میں لکھا ہے جس کے صرف پانچ شعر آپ کی خدمت میں حاضر کرتا ہوں امید ہے کہ آپ کو پسند آئے۔ وہ اشعار اس طرح ہیں:

بزم رہبر میں ملے جب حاجی منظر ایک بار
ملتے ہی دل ہوگیا ان کے محبت کا شکار
برد باری، خاکساری، دین داری، سادگی
غور سے دیکھیں تو ان میں خوبیاں ہیں بے شمار
خدمت خلق خدا ہے مشغلہ دن رات کا
بے سہاروں کو سہارا دینا ہے ان کا شعار
میں رسول پاک کی سنت پہ عامل اس لئے
ہیں مخالف ان کے تھوڑے، دوست انکے بیشمار

جناب ذکی احمد نے مکمل طور پر ان کے وہ تمام صفات کا ذکر کیا ہے جو ان کے اندر موجود ہے تاکہ پڑھنے والے کو ان سے محبت پیدا ہوجائے اور وہ پڑھتے وقت مایوس نہ ہوں۔ حقیقت پر مبنی بات کو آپ نے کلام کی شکل میں سامعین کے سامنے رکھا ہے۔

پروفیسر عبدالمنان طرزی اردو ادب شہر دربھنگہ کے ایک عظیم شخصیت کے طور پر جانے پہچانے جاتے ہیں۔ خاص کر بہار میں اور ہندوستان کے کونہ کونہ میں ان کا نام کا شہرہ عام ہے۔ آپ نے بھی منظر صدیقی کے اوپر مشمولہ متفرقات طرزی جلد دوم ۲۰۱۷ء میں اس کلام کو شائع کیا تھا اور یہ کلام اس مجموعہ کا حصہ بھی ہے۔ ان کے مدح میں جو انہوں نے ان اشعار کو پیش کیا ہے ان کو ملاحظہ فرمائیں:

منظر صدیقی ہے اسم گرامی آپ کا
خدمت شعر و ادب بھی جن کا ہے ایک مشغلہ
زینت بزم سخن بن کر رہے
شاعری بھی خوب ہی کرتے رہے
بزم رہبر کے ہیں اب سکریٹری
کرتے ہیں اردو کی خدمت خوب ہی
واردات دل پہ مبنی اک کتاب
لائے ہیں غزلوں کا مجموعہ جناب
خادم اردو یہ ہیں فعال ہی
اس میں کوتاہی نہیں ہوتی کوئی
حق میں ان کی بھی ہے طرزی کی دعا
کامیاب و کامراں رکھے خدا

حافظ عبدالمنان طرزی نے اس ۲۱ / اشعار پر مشتمل کلام میں شاعر کی خوبیوں کے ساتھ ان کے تمام کمالات کو پیش کیا ہے آپ نے شاعری کے ذریعہ شاعر کے احوال کا ذکر پس پردہ کر دیا ہے ان کی شخصیت و حالات، تعلیم، ملازمت جیسے اہم موضوع کا ذکر بڑی دانشمندی کے ذریعہ کیا ہے کیونکہ عبدالمنان طرزی صاحب شاعری کے افق پر درخشاں ستارہ کے مانند ہیں

اوران کی نظر شاعروں کے حرکات وسکنات پر ہوا کرتی ہے ان کی نظر سے شاعروں کے کرداروں کا چھوٹنا بہت ہی مشکل ہے۔ ہر چند کے پروفیسر صاحب نے جانفشانی کے ساتھ ان کے اوصاف کو نمایاں کیا ہے۔

پھر جناب منیر سیفی نے اس مجموعہ نظر نظر منظر کے اوپر قطعات تاریخ کو رقم کیا ہے جس سے آپ حضرات بھی فیض حاصل کر سکتے ہیں جن کے قطع کچھ اس طرح ہیں:

ارض و سما تک فطرت کی گلکاری ہے
جدھر دیکھئے نظموں کی پھلواری ہے
آخر مصرع سے تاریخ نکالیں گے
ابھی تو سیفی یہ تمہید کی تیاری ہے
نظر نظر منظر سے مطبع ہیں لیکن
چرچا اس کا محفل محفل جاری ہے

جناب سیفی صاحب نے بڑے خوبصورت انداز میں ان اشعار کو ترتیب دے کر سامعین کے دلوں کو موہ لیا ہے اس مجموعہ میں عمدہ طور پر پیش کیا ہے جن کو پڑھ کر دل داد دینے کے لئے بے قرار ہو جاتا ہے۔

منظر صدیقی نے کلام کے اس مجموعہ کا آغاز لا الہ الا اللہ کے دو مصرعہ کے ساتھ کیا ہے جو اللہ کی حمد وثنا بیان کرتے ہوئے نظر آتے ہیں وہ جو شعر کچھ اس طرح ہیں:

زباں پہ رکھئے سدا لا اللہ الا اللہ
کلام حق ہو ادا لا الہ الا اللہ
ہے دین دنیا کی اس میں بھلائی اے منظر
اسی پر دل ہے فدا لا الہ الا اللہ

پھر آپ نے حضور ﷺ کی شان معظم میں قلم سے نعت پاک رقم کیا ہے جو چار اشعار پر مشتمل ہے وہ یوں دیکھیں:

ہر لمحہ پڑھتے رہئے صلی علی محمدؐ
اپنی زباں پہ رکھئے صلی علی محمدؐ
دنیا و آخرت میں رحمت خدا کی ہوگی
نام نبی یہ کہئے صلی علی محمدؐ
صورت نجات کی ہے صل علی محمدؐ
ظلمت میں روشنی ہے صلی علی محمدؐ
اے عاشقان احمدؐ پڑھتے رہو ہمیشہ
اظہار عاشقی ہے صلی علی محمدؐ

شاعر نے محبت وعقیدت کے ساتھ ان چار اشعار کو قلم بند کیا ہے واقعی نبی سے محبت کرنے والے حضرات ان اشعار پر داد دیئے بغیر نہیں رہ پائیں گے اور یہی محبت کی دلیل ہے کہ محبوب کی تعریف کھل کر بیان کی جائے تا کہ محبت کا چرچا عام ہو جائے یہی کام جناب صدیقی نے کیا ہے۔

منظر حسین نے دنیا کو محبت کو پیچھے چھوڑ کر عقبا کی محبت کو مقدم رکھ کر نعت نبی لکھی ہے کیونکہ ان کو اپنے نبی سے بے انتہا عقیدت ہے۔ آگے ان کی غزلوں کا ذکر شروع ہوتا ہے جو آپ نے مختلف پروگراموں میں پیش کیا اور یہ مختلف رسائل اور جرائد میں ہندوستان کے اندر شامل ہوئے۔ منظر نے غزلیہ اشعار پیش کئے ہیں۔ ان کے اشعار اپنی جانب کھینچتے ہیں وہ یہ ہیں:

زمانے والے ہمیں اب مٹا نہیں سکتے
ہم ایسی آگ ہیں جن کو بجھا نہیں سکتے
یہ تشنہ کام ہیں ساقی؟ تو ان کو دے ساغر
پئے بغیر یہ محفل سے جا نہیں سکتے
ہمارے عہد کے خنجر نما مسیحاؤں
جو زخم تم نے دیئے ہیں دکھا نہیں سکتے
میں جانتا ہوں تم آؤ گے وقت نزع ضرور
مگر کسی بھی طرح آگے جا نہیں سکتے

اس طرح کے بہترین کئی اور غزل آپ نے اس مجموعہ میں شامل کئے یں جن کو پڑھ کر دل داد دینے کو جی چاہتا ہے پھر آگے کچھ اس قسم کے غزلیہ اشعار کو رقم کیا ہے صرف دو اشعار دیکھئے:

تو اپنے ساتھ لے آیا زمانے بھر کی محرومی
مجھے ہر شخص تیرے دور میں بے کل نظر آیا
اِدھر بسمل، اُدھر بسمل، یہاں لاشے، وہاں لاشے
ہر اک کوچہ تمہارے شہر کا مقتل نظر آیا

بہت اچھے انداز میں شاعر ادب نے اپنی بات کو سامعین کے سامنے پیش کیا ہے ان کی نظر زمانہ پر بھی ٹکی ہوئی رہتی ہے لیکن اس زمانہ کے لوگوں پر آپ نے بھی عمدہ غزلیہ اشعار کہے ہیں۔ ان کی شاعری میں اشک بن کر لہو، غربت میں کیا ہو نہیں جاتا ہے، دریا کو قطرہ، قطرہ کو دریا نہ کیجئے، زندگی اتنی سستی دیکھی، آئینہ دکھانا ہے دکھاتے رہیں، جشن آزادی کا ہم مناتے جائیں گے۔ ان تمام کے اشعار عمدہ اور لاجواب ہیں جو اپنی جانب کھینچتی ہیں۔ آگے بڑھتے ہوئے منظر حسین نے بڑی خوبصورت غزل کے اشعار کو رقم کیا ہے جو دل پر اثر ہونے والے ہیں جن کے صرف دو شعر آپ کی نذر کرتا چلوں:

جو ہاتھوں میں لئے خود آئینہ ہے
وہی اوروں پہ پتھر پھینکتا ہے
اٹھاتا ہے جو انگلی دوسروں پر
گریباں کب وہ اپنا جھانکتا ہے

پھر بڑھتے ہوئے محبت وعشق، بغض و عداوت پر مشتمل اشعار کو آپ نے کلام کی شکل میں حاضر کیا ہے جن کے پڑھنے سے حالت حاضرہ کا جائزہ نظر آتا ہے۔ آپ نے ایسی شاعری کی ہے جیسے کے ان سے کوئی ان حالات پر لکھنے کو مجبور کر دیا ہو۔ وہ بند کچھ اس انداز کے ہیں:

وفا کی پیار کی اور دوستی کی بات کرتے ہیں

ملاتے ہاتھ ہیں اور دشمنی کی بات کرتے ہیں
ہمارے شہر میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اکثر
جلا کر گھر ہمارا روشنی کی بات کرتے ہیں

یہ مقطع کا شعر جو آج کے مسلمانوں کے مکمل حالات کی عکاسی کرتا ہے۔ وہ کچھ اس طرح کا ہے:

کچھ ایسے بھی ہیں اے منظر جو دل میں بغض رکھتے ہیں
مگر ملتے ہیں جب وہ دوستی کی بات کرتے ہیں

ان کی شاعری کے ان اشعار سے مجھے کسی کو نیچا دکھانے کا مقصد نہیں ہے صرف اور صرف ان کے شعر کو نصیحت کے طور پر میں ان کے مجموعہ سے لیا ہے تاکہ میری بھی اصلاح ہوسکے ساتھ ساتھ ہمارے سماج کے اندر جو کچھ خرابی موجود ہے وہ دور ہوسکے۔

پھر آپ نے آگے کچھ اس انداز کی مزاحیہ شاعر کو سامنے رکھا ہے:

اردو پیاری
ہندی نیاری
رات اندھیاری
ڈر ہے بھاری
راہ کٹھن ہے
وقت ہے بھاری
تیری آنکھیں
نین کٹاری
رسم رشوت
ہر سو جاری
تم سا منظر
کون ہے قاری

اس نظم کے بعد آپ نے مجھے گھر نکلنا چاہئے تھا، بات حق کی ہمیشہ کرتا ہوں، زباں خاموش چہرہ بولتا ہے، اک جہان دیگر، ڈھونڈتا ہوں، ہمارے بھی حالات بدلیں گے، اک دن کے عنوان سے غزلیں کہیں ہیں جو دل کو چھوجاتے ہیں۔ پھر ان کی غزل کہ کچھ بول اس طرح نظر کے سامنے آتی ہے جن کے مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیں:

جب شب ہجر ستاتی ہے غزل ہوتی ہے
آپ کی یاد جب آتی ہے غزل ہوتی ہے
نیند آنکھوں سے اڑاتی ہے غزل ہوتی ہے
جب تیری یاد جگاتی ہے غزل ہوتی ہے

اور ایک شعر کچھ اس طرح کا ہے جو آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں:

دور حاضر کا سمجھ لیجئے غالب مجھ کو
مئے وہ کافر جو پلاتی ہے غزل ہوتی ہے

آپ نے مفلس انسان کی بے بسی پر کلام کو پیش کیا ہے جن کے سات بند میں صرف دو شعر پیش کرتا ہوں آپ ان کو دیکھیں:

نیا خواب آنکھوں میں لائیں گے ہم
غریبوں کی بستی سجائیں گے ہم
زمانے نے جن کو ہے ٹھکرا دیا
کلیجے سے ان کو لگائیں گے ہم

منظر صدیقی کی شاعری میں ایک عجب رنگ موجود ہے وہ شاعری کرتے ہوئے اپنے دوستوں کے اوصاف کا ذکر بڑے بہتر انداز میں کر کے گزر جاتے ہیں جن کی مثال آپ ان کے اس کلام سے لگا سکتے ہیں۔ وہ شعر کچھ اس طرح نظر آتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

اتنی جو پہچان ہے منظر
یاروں کا احسان ہے منظر
داناؤں کی صحبت میں بھی
سنتے ہیں نادان ہے منظر

ان کی شاعری میں خود کو نمایاں کئے ہوئے اشعار بھی ہیں جن کو پڑھنے سے خوشی ملتی ہے مگر بعض شعر کہیں کہیں پر کمزور بھی پڑتے نظر آجاتے ہیں۔ ان کی شاعری کو اوسط درجہ کی شاعری ہے۔ یوں تو ان کی اس کلام کے بعد دوسرے کئی کلام غزل میں ہیں مگر آخری میں اس غزل کے خاص بند کو آپ کی خدمت میں حاضر کرتا ہوں جو ۱۴/ بند پر ہیں۔ آپ کا ذہن ان اشعار سے قرار حاصل کرسکے وہ یہ ہیں::

آفت میں ہے جان لکھو
دنیا کر سرطان لکھو
اوروں کے جو کام آئے
بس اس کو انسان لکھو
میز پہ ٹی وی رکھا ہے
طاقوں میں قرآن لکھو
سب بھاشا کے لوگ جہاں
اس کو ہندوستان لکھو

منظر صدیقی کی زندگی دوسروں سے مختلف گزری ہے مگر ان تمام زندگی کے مصائب کو وہ خود حل کرتے گئے کسی کے سامنے ذکر نہیں کیا۔ ان تمام جدوجہد کے باوجود بھی انہوں نے ادبی سفر کو جاری وساری رکھتے ہوئے اردو زبان کی خدمت کی۔ اس ذوق کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے سفر جاری وساری ہے۔ مجھے امید ہے کہ ہر وہ انسان جو اس زبان کو بولتا ہے، سمجھتا ہے اور پڑھتا ہے اگر وہ اپنی جانب سے اس زبان کو ترقی کا خواہش مند ہوجائے تو یہ زبان دن دونی رات چوگونی کی رفتار سے دنیا کے دوسرے زبانوں کی طرح مشہور ومعروف ہوگی۔ یہی ہم پر یہ فرض ہے کہ ہم اس زبان کو اپنی زندگی میں رچا بسا کر زندگی گذاریں۔

❑❑❑

ماضی میں اردو کا خوشنما جزیرہ؛ جاؤرہ



سید سرور علی

ریسرچ اسکالر

گورنمنٹ مادھو پی جی کالج

اجین (مدھیہ پردیش)

رابطہ: 9893520675

وسط ہند اور راجپوتانہ کی جن مسلم ریاستوں نے اردو زبان وادب کی ترقی وترویج اور بقاء وتحفظ میں قابل فخر خدمات انجام دی ہیں ان میں ریاست جاؤرہ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ ریاست اردو کی آبیاری میں بھوپال اور ٹونک کے ہم سر ہے۔ اس ریاست کے بانی نوابی عبد الغفور خان تھے۔ 1947 عیسوی تک یہاں چار نوابین نے حکومت کی۔ پہلے نواب عبدالغفور خان، دوسرے نواب غوث محمد خان، تیسرے نواب محمد اسمٰعیل خان اور چوتھے نواب سر محمد افتخار علی خان تھے۔ 1947 عیسوی میں جب ہندستان آزاد ہوا تو یہ ریاست ہندستان میں ضم ہوگئی۔ یہ ریاست علم و ادب سے زرخیز ریاست رہی ہے یہاں کے والیانِ ریاست نے اپنی عملداری میں علم پروری اور ادب نوازی کی روایت مستحکم کی۔ نواب عبدالغفور خان نے اپنے عہدِ اقتدار میں رامپور، دہلی، اور ٹونک وغیرہ سے علماء فضلا کو جاؤرہ ریاست میں جمع کیا۔ ہندوستان کے علمی وادبی مراکز سے جاؤرہ میں بہت سے اہلِ علم وفن 1947 تک آتے رہے۔ زیادہ تر لوگوں نے یہاں سکونت اختیار کر لی۔ دہلی سے آنے اور جاؤرہ میں قیام کرنے سے شہر والوں پر دہلی کی تہذیب وادب کا بہت اثر پڑا۔

نواب غوث محمد خان نے ریاست کو بڑی ہی خوش اسلوبی سے چلایا۔ یہ بیدار مغز اور سلجھے ہوئے نواب تھے اور نہایت وجیہ وشکیل اور فربہ اندام تھے۔ عقل وفراست حکمتِ عملی اور سیاست دانی میں لاجواب، رعایہ پرور، خلیق، بامروّت حلیم وبردبار، مدبّر ومنظّم، قدردان وقدرشناس، بہترین ادیب اور ادب نواز انسان تھے بذاتِ خود ان کی تصنیفات ان کی ادبی ذہانت پر بھرپور روشنی ڈالتی ہیں جو آج بھی باقی ہیں۔ ۱۸۲۵ عیسوی میں جب آپ نواب بنے تو اس وقت آپ کی عمر تقریباً تین برس تھی کم سنی کی وجہ سے نواب غوث محمد خان کو ریاست کے مکمّل اختیارات ۱۸۴۰ عیسوی میں حاصل ہوئے اور آپ ہی کے زمانے میں جدید محل سرا اور اس کے قریب ایک کوٹھی نما دیوان خانہ تعمیر کرایا گیا کئی محلّے آباد کرائے گئے وسط شہر میں کوتوالی کی عمارت تعمیر کرائی گئی پل پختہ جو کہ سنگِ سرخ سے تعمیر کرایا گیا جس کی عکسی اور قلمی تصاویر جو اس زمانے میں ہندوستان آنے والے برٹش مہمانوں نے لیں

آج بھی برٹش لائبریری رونق افروز کر رہی ہیں۔ اسی پل کے کنارے دربار کیلئے ایک نہایت خوبصورت عمارت تعمیر کرائی گئی جو آج بھی قابلِ دید ہے اور اپنے مقام پر آج تک سر اٹھائے شان سے کھڑی ہے ،فی الحال یہاں گورنمنٹ جنرل پوسٹ آفس ہے۔

افتخار الدولہ نواب عبدالغفور خان کے بعد محتشم الدولہ نواب غوث محمّد خان بہادر شوکت جنگ کا دور جاؤرہ کی تاریخ کا عہدِ زرّیں تصوّر کیا جاتا ہے۔ان کے زمانے میں جاؤرہ شاد و آباد اور ایک گلشن کی طرح شگفتہ تھا اسی مناسبت سے نواب غوث محمد خان نے جاؤرہ کا نام 'گلشن آباد' رکھا۔انہوں نے دہلی ،لکھنؤ، کانپور، بریلی، رامپور اور شاہجہاں پور وغیرہ مقامات سے قابل ہستیوں کو چن کر جاؤرہ بلایا اور ریاست کا کام ان کے سپرد کیا اور انہیں ہمیشہ کیلئے یہیں آباد کر دیا اس سلسلے میں منشی عظیم بیگ کا نام قابلِ ذکر ہے، منشی عظیم بیگ محمد رفیع سودا کے شاگرد تھے اور بے بدل منشی بھی تھے، انشاء سے آپ کی نوک جھونک کے قصّے اردو ادب کی تاریخ کا اہم سرمایہ ہیں، وہ صاحبِ دیوان شاعر بھی تھے، ان کا تذکرہ محمّد حسین آزاد نے "آبِ حیات" میں کیا ہے، ان کی قلمی تحریروں کا کافی ذخیرہ ان کے صاحب زادے حضرت خطیب گلشن آبادی کے پاس تھا جس میں ان کا قلمی دیوان بھی تھا جو خطیب صاحب نے ادارہ ادبیات دکن حیدرآباد کی نذر کر دیا، تاکہ محفوظ رہے اربابِ تحقیق اس سے استفادہ حاصل کر سکیں۔

آپ کے زمانے میں شہر میں جا بجا مکتب کھولے گئے جن میں اردو، عربی، فارسی، اور خوشخطی کی تعلیم دی جاتی تھی یہ اسی ماحول کے اثرات ہیں کہ اہالیانِ جاؤرہ کی اردو زبان اور خوشخطی کی پورے ہندوستان میں دھوم تھی۔ نواب غوث محمد خان کی ادب نوازی کی مثالوں میں ایک مثال مولوی غیاث الدین صاحب ہیں۔جن کی مشہور و معروف کتاب "غیاث اللغات" سے تقریباً ہر ادیب واقف ہے۔ یہ کتاب نواب غوث محمد خان کے مالی تعاون سے شائع ہوئی تھی۔نواب صاحب موصوف نے غیاث الدین صاحب کو ایک ہزار روپیہ بھجوائے تھے اور مطبوعہ کتابیں جاؤرہ منگوا کر اہلِ جاؤرہ میں فروخت کرا کر اس کا منافع غیاث صاحب کو بھجوادیا تھا۔اس واقعہ کا ذکر غیاث الدین صاحب کے صاحبزادے عظیم الدین صاحب نے اپنی ایک قلمی کتاب انشائے عظیم کے ایک خط میں کیا ہے۔نواب موصوف نے ریاست میں جو ایک دارالطبع قائم کیا تھا اس میں کتابوں کی اشاعت کے علاوہ سرکاری کاغذات اور جرائد بھی شائع کئے جاتے تھے اس کا انتظام منشی نصراللہ بیگ صاحب کے سپرد تھا جو ایک اچھّے خطّاط ہونے کے علاوہ ایک اچھّے منشی بھی تھے۔ نواب غوث محمد خان کی کتاب "سیرِ سلاطینِ دہلی" اسی مطبع سے شائع ہوئی تھی جس کتاب میں مغلوں کے ابتدائی دور سے آپ کے زمانہ تک ہر بادشاہ کی عمر، وفات اور وقفہ حکومت درج ہے ان کی سلطنت کا پھیلاؤ ،آمدنی، جمع، خرچ کا حساب اور اولاد و بیگمات کا تفصیل سے اندراج ہے یہاں آپ کی ذاتی تصنیف ہے۔ یہ تمام کارنامے ان کی ادب و علم دوستی کو ظاہر کرتے ہیں۔آپ نے جو تعمیرات کرائیں ان کی تاریخیں پتّھروں پر کندہ کرائیں۔شہر کے وسط میں سنگِ سرخ سے بنا پل پختہ اور لال مقبرہ پر تاریخ کے پتّھر آج بھی ان کے ادیب ہونے کا ثبوت دے رہے ہیں۔وہ بذاتِ خود بھی ایک اچھے ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ ادب نوازی میں بھی اپنی مثال آپ تھے۔ ان کی ذاتی تصانیف میں ان کا سفرنامہ "سیرِ محتشم" جس سیآپ کے سیر و شکار کے شوق کا پتہ چلتا ہے، آپ کو شکار سے تو بہت زیادہ دلچسپی تھی، آپنے جاؤرہ سے راج گڑھ ہوتے ہوئے اندور، دہلی اور پھر وہاں سے اجمیر ہوتے ہوئے جاؤرہ تک کا سفر کیا جس کی یادگار تصنیف "سیرِ محتشم" ہے یہ سفرنامہ جاؤرہ ہی کے پریس میں چھپ کر شائع ہوا تھا جس میں جا بجا سفر کے حالات کے علاوہ قلمی تصاویر بھی پیش کی گئی ہیں یہ سفرنامہ نہ صرف ادبی سرمایہ ہے بلکہ اس دور کی معاشرت اور تاریخ کے لئے ایک مستند دستاویز ہے ، جس میں اس زمانے کا ہندوستان سانسیں لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور یہ جاؤرہ کے اردو ادب کا ایک مربوط سرمایہ ہے جو ۶۶۰ صفحات پر مشتمل ہے ،اس میں نواب غوث محمّد خان نے دہلی ،لکھنو ،کانپور، بریلی ، شاہجہاں پور وغیرہ کے سفر کے حالات کے علاوہ بہت سی قابلِ قدر ہستیوں سے ملاقات کا تذکرہ بھی کیا ہے جس میں خصوصی طور پر دہلی کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر جو ان کے عزیز بھی ہوتے تھے، ان سے ملاقات کے علاوہ دہلی کے مشہور و معروف خوشنویس میاں پنجہ کش (محمد امیر رضوی) غالب، ذوقؔ، مومنؔ وغیرہ سے ملاقات کا ذکر بھی ہے۔ سفر سے واپسی میں کانپور سے اپنے ہمراہ مرزا عظیم بیگ کو لائے اور ان کو میر منشی کے عہدے پر فائز کیا جو آج پرائیویٹ سکریٹری کے ہم مرتبہ سمجھا جا سکتا ہے۔ مجمع سلاطینِ دہلی" یہ ایک ایسی تواریخی تصنیف ہے جس میں نواب

غوث محمد خان نے دہلی پر حکومت کرنے والے تمام بادشاہ ابتدا سے لے کر نواب صاحب کے زمانے تک جو جو بادشاہ یہاں حکومت کرتے رہے سبھی کا اندراج کیا ہے۔آپ کی اور تصانیف" شکارنامہ محتشمی"،"فرس نامہ"اور"بغاوتِ مالوہ" ہیں۔ان میں سے ایک کتاب"بغاوتِ مالوہ" کا ذکر"تاریخِ یوسفی دربار جاؤرہ" میں اس طرح ملتا ہے:۔

عزیز القدر محمد یوسف خان منشی گیرائی سرکار جاؤرہ بعافیت باشند۔ درسن ۱۲۷۵ عیسوی حین غوغائے رستخیز بہ باغیان فرجام و مفسدان بدسرانجام کہ عالمی از وساوس شان مطمئن بنودایشان پائے ثبات در زمین ارادت قایم داشتہ بکارہاء خیراندیشی پرداختہ مابدولت راخوش داشتند کہ درجلدونآن حسن خدمتی وثیقہ ہذا کہ متضمن بہ نیک نامی است عطافرمودیم وخلعت برآن مستزاد۔

(فی التاریخ ۵ / شھر شوال ۱۲۷۶ ہجری مطابق بست وہفتم اپریل ۱۸۶۰ عیسوی)

شکار نامہ محتشمی" نواب غوث محمد خان کی ایک اور یادگار اور آخری تصنیف ہے جس کے بارے میں یہ تصدیق نہیں کہ یہ شائع ہوئی یا نہیں، اس کا مخطوطہ موجود ہے جو بہت شکستہ حالت میں ہے۔یہ تصنیف ایسی ہے جسے منظر عام پر لانا جاؤرہ کے اہلِ علم وادب کا فرض تھا مگر نواب غوث محمد خان کے بعد ان کے صاحبزادے نواب اسمٰعیل خان اور پوتے نواب افتخار علی خان کے زمانے میں کیوں اور کس وجہ سے منظرِ عام پر نہیں لایا گیا جبکہ آپ دونوں کے زمانے میں علم وادب کے بڑے بڑے علما وفضلا موجود تھے۔اس کے بعد جب ریاست گلشن آباد جاؤرہ کا مدھیہ بھارت میں انضمام ہوا اس وقت بھی ادبی لحاظ سے فضا و حالات بہت اچّھے تھے۔اردو شعر و ادب، مشاعرے، اخبار،رسائل و جرائد کی اشاعت سب کچھ بدستور چلتا رہا" دارالمطالع" لائبریری کا برسوں جاؤرہ میں قیام رہا،اور" دارالطبع محتشمی" جو شہر گلشن آباد جاؤرہ کا مشہور چھاپہ خانہ تھا اور اس کی طبع کی ہوئی ہزارہا کتابیں تھیں اور آج بھی موجود ہیں جن میں ایسی کوئی اصنافِ سخن و اصنافِ ادب نہیں جس کی اشاعت نہ ہوئی ہو،مگر سوال یہ اٹھتا ہے کہ اس شکارنامہ کی طرف کوئی بھی تنظیم،انجمن یا اہلِ علم حضرات جنہوں نے جاؤرہ میں اپنی پوری عمر بسر کی مگر ان لوگوں نے بھی اس" شکار نامہ محتشمی" پر توجہ نہیں دی۔ممکن ہو کہ ان کے زمانوں میں یہ قلمی نسخہ دستیاب نہ ہو سکا ہو۔مگر الحمدللّٰہ مجھے یہ نسخہ بہت ہی شکستہ حالت میں دستیاب ہوا۔اب جبکہ یہ قلمی نسخہ نظر سے گذرا تو اسکے زبان و بیان اور اندازِ تحریر سے اس کی ادبی اہمیت کا اندازہ ہوا۔نواب غوث محمد خان چونکہ اس سے پہلے بھی"سیرِ محتشم"، مجمع السلاطینِ دہلی" اور"فرس نامہ"تحریر کر چکے تھے اور آپ کی یہ تینوں تخلیقات شائع ہو چکی تھیں۔"شکارنامہ محتشمی" کو ان کتابوں کی بہ نسبت دیکھا جائے تو تو اس کی زبان اور اندازِ بیان کافی سادہ و سلیس نظر آتی ہے۔زبان کے علاوہ برجستگی الفاظ اور خوبصورت نثر کا ایک الگ انداز ہے جو اس زمانہ کے رنگ میں رنگا ہوا نظر آتا ہے۔اس کتاب کا موضوع بھی مختلف ہے اور اپنے آپ میں ندرت رکھتا ہے۔کیونکہ شکار کے موضوع پر بہت کم لکھا گیا ہے جہاں تک میرا مطالعہ ہے شہر جاؤرہ میں تو نواب غوث محمد خان سے پہلے یا اس کے بعد میں بھی اس موضوع پر کوئی کتاب نہیں لکھی گئی، بلکہ اس شکارنامہ پر بھی نظر نہیں کی گئی۔جس زمانے کی یہ تخلیق ہے اگر اس زمانے میں منظرِ عام پر لایا جاتا تو اردو ادب میں اس کی حیثیت سنگِ میل کی ہوتی اور شکاریاتی مہمّات پر لکھی گئی کتابوں میں اس کا بھی مقام ہوتا۔

نواب غوث محمد خان نے اس شکارنامہ میں اپنی صغر سنی سے لے کر اپنے زمانہ حکومت تک جتنے بھی شکار کئے ان سب کا بڑی تفصیل کے ساتھ اور بڑے دلچسپ انداز میں ذکر کیا ہے ،آپ کا اندازِ بیان ایسا ہے کہ اگر ایک شکار کا قصہ قاری پڑھنا شروع کر دے تو وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر اسی شکاریاتی مہم کا ایک حصہ بن جاتا ہے منظر نگاری جو اس شکارنامہ میں پیش کی گئی ہے وہ بے مثال ہیں۔جنگل، پہاڑ، دریا، گپھائیں، درخت، جھاڑیاں ، جانوروں اور پرندوں کے ہجوم، راستے، نالے، گھاٹ، ٹیلے، ہاتھیوں کی سواری، ریچھ، شیر اور شیرنیوں کے شکاریوں کے ساتھ بہترین مقابلے غرضیکہ شکار کے متعلق ہر ایک بات جو آپ کے ساتھ گذرے آپنے اسے درجہ بدرجہ بڑی خوبصورتی اور سلیقے سے عبارات کے قالب میں ڈھالا ہے۔زبان اور بیان آپنے اپنی پچھلی تمام تر تخلیقات سے آسان تر استعمال کیا ہے۔تصاویر تمام قلمی ہیں، اس زمانے میں مستعمل ہتھیاروں کا ذکر، دام میں لانے کے لئے جانوروں مثلاً بھینس ے وغیرہ کا استعمال، حالانکہ جو اس مہم کا ایک خاص حصہ ہوتا ہے اور ہانکہ کرنے والے افراد غرضیکہ وہ تمام تر باتیں جو شکار سے متعلق ہیں بہت عمدہ طریقے سے رقم کی ہیں جس کی وجہ سے شکار نامہ دلچسپ اور قابلِ مطالعہ بن گیا

ہے۔آپ کے دور میں بھی بڑی تعداد میں شعرا و ادبا موجود تھے۔ ۱۸۶۵ عیسوی میں یہ علم وادب کا آفتاب ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا۔اور دور نواب محمد اسمٰعیل خان کا شروع ہوا۔

نواب محمد اسمٰعیل خان بھی ایک ادب نواز انسان تھے۔ انہیں اردو فارسی اور انگریزی زبان پر پورا عبور حاصل تھا،ان کے دور میں اردو عربی اور فارسی کی تعلیم کے لئے دہلی سے استاد سعید بخت صاحب کو بلایا گیا تھا جو ایک ماہر تعلیم اور خوش نویسی میں اپنی مثال آپ تھے۔وہ عمدہ شاعر تھے،اپنے ٹھمریاں غزلیات، گیت،منظومات، قصائد و مراثی، قطعات و رباعیات،مثنویات و قصہ گوئی غرضیکہ سبھی اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کی۔انہیں کو داستانیں سننے کا بہت شوق تھا اس لئے داستان گو بھی ملازم تھے اور وہ رات کو انہیں ''داستانِ امیر حمزہ'' اور ''بوستانِ خیال '' کے قصے سنایا کرتے تھے۔آپ کے دور میں اردو ادب نے بہت ترقّی کی اور بہت جیّد علماً و فضلاً اس دور میں رہے اور آج تک ''صوفیانِ جاؤرہ'' انہیں قابلِ قدر ہستیوں کی وجہ سے مشہورِ زمانہ ہیں۔ اس زمانہ میں جو صاحبِ قلم لوگ گذرے ان میں سے چند لوگ جن کا ذکر کرنا ضروری ہے، مثلاً آپ کے دور میں ایک قابلِ قدر ہستی پیر جی محمد یوسف خان صاحب تھے جو کافی طویل العمر شخصیت گذرے ہیں،نواب غوث محمد خان سے لے کر چوتھے نواب افتخار علی خان کا بھی کچھ دور دیکھا تھا۔ وہ نواب صاحب کے مقرب و قرابت دار تھے اس بات کا پیر جی محمد یوسف خان نے اپنی کتاب سوانح عمری یوسفی'' میں بہت وضاحت کے ساتھ اس طرح بیان کیا ہے کہ ان تمام لوگوں کا ذکر اور نام کے ساتھ رشتوں کی وضاحت بخوبی ہوگئی مثلاً عبارت کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

'یہ راقمِ اوراق ایسے باپ نانا و نام آور ظل گستر راسخ دم ثابت قدم مقرّب قرابت رئیس اعظم والا.....اور نواب افتخار علی خان بہادر کا چچا زشتہ کا منسلک ہے۔'

(از سوانح عمری یوسفی صفحہ ۴۱)

یہ سوانح عمری یوسفی'' در اصل اہلِ دفتر اخبار وفادار دہلی و پنچ پریس لاہور نے سوانح عمری مع تفصیل تصانیف کے پیر جی محمد یوسف خان سے طلب کی تو انہوں نے ۷۵ سال کی عمر میں صرف ۱۵ روز میں مکمل کتاب لکھ ڈالی، یہ واقعہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۰۳ عیسوی کا ہے کہ جب یہ کتاب اختتام کو پہنچی اس کتاب کے بارے میں ایک بات واضح ہو کہ یہ کتاب مخطوطہ کی شکل میں راشد برہانپوری صاحب نے ۲۷ ستمبر ۱۹۵۴ عیسوی کو ڈاکٹر مولوی غلام مصطفیٰ خان کو کراچی میں عنایت فرمائی تھی اور اور راشد صاحب بڑے فضل اور کمال کے تھے۔تاریخ گوئی میں بڑی مہارت تھی خطِّ شکستہ پڑھنے میں بھی کمال حاصل تھا۔علم کے دھنی تھے،جن کے مخطوطات سندھ یونیورسٹی میں آج بھی محفوظ ہیں آپ کے حالات کی تفصیل ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان نے اپنی کتاب ''نعمتِ علم'' میں درج کی ہے، درج بالا باتوں کا ذکر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں نے ''سوانح عمری یوسفی'' کے ابتدائیہ میں خود کیا ہے۔آپ کئی سال صوفیوں اور بزرگوں کی صحبت میں رہے اور بزرگوں سے فیض یابی ہوئی خصوصاً اسی دوران آپ مولوی دلدار علی شاہ صاحب المعروف میاں مذاق صاحب بدایونی قدس سرّہ سے خاص بیعت و کرم اور لطائف خمسہ جاری ہوئے اس کے بعد آپ پر تمام راز منکشف ہو گئے اور اضطرابی دل مبدّل بشکیبائی پائی اور آپ میاں مذاق صاحب قدس سرّہ کی حسبِ اجازت ۱۵ شعبان ۱۲۸۱ ہجری کو واپس جاؤرہ کامیاب و کامران لوٹے اور نواب غوث محمد خان کے ساتھ رہتے ہوئے جاؤرہ اور نواب عبدالغفور خان صاحب کے حالات لکھنا شروع کئے جسے ''تاریخِ یوسفی دربار جاؤرہ'' کا نام دیا گیا۔مگر اس کتاب میں اسی مہد پور جنگ کے حالات تک تاریخی حالات رقم کئے گئے تھے کہ نواب غوث محمد خان کا انتقال ہوگیا۔یہ بات ماہ ذالحجہ ۱۲۸۱ ہجری کی ہے۔اس تصنیف میں اپنی سوانح حیات کے علاوہ پورے خاندان کے سوانحی حالات آپ نے بڑے منظّم طریقے سے رقم کئے ہیں۔اور جاؤرہ اور یہاں کے تمام لوگوں کے مفصل حالات کے ساتھ ساتھ جو اک رنگ آپ پر غالب تھا وہ اوّل تا آخر صاف نظر آتا ہے جس کا نام صوفیانہ'' رنگ ہے کیونکہ آپ خود ایک صوفی بزرگ گزرے ہیں اس وجہ سے آپ ابتدا سے جن صوفیا کرام سے ملاقات کی ان سبھی کے نام کے ساتھ ساتھ کشف و ہدایت کے پراسرار قصّے بڑے خوبصورت انداز میں بیان کئے ہیں۔ ایک خود نوشت سوانح ہے اس وجہ سے اس میں آپ نے اپنے اور اپنے ساتھ پیش آنے والے تمام واقعات درج کئے ہیں اس کتاب کے علاوہ اور ۱۴ مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتب بھی تحریر کی ہیں جن میں'' پیراہنِ یوسفی'' جو آپ کا بہت اعلیٰ درجہ کا کارنامہ ہے اور یہ مثنوی مولانا روم کا آسان زبان میں ترجمہ اور سلیس عبارت میں لکھی تفسیر بھی ہے۔یہ ۶ جلدوں میں

نول کشور پریس لکھنو سے شائع ہوئی۔"شرح دیوانِ حافظ" بھ آپ نے لکھی ہے جو بعنوان شرحِ یوسفی "لکھی گئی۔" میلادِ غوثیہ" بھی مطبوعہ ہے۔ایک اور تصنیف "مخزن الانوار" جو ترجمہ "گنج الاسرار" از خواجہ غریب نواز ہے وہ بھی ۱۲۹۲ ہجری میں نول کشور پریس سے شائع ہوئی ہے۔" مولد شریف" منظوم ۱۳۰۵ ہجری میں انوارِ محمدی لکھنو سے شائع ہوئی۔" چار باغ" ترجمہ چہار گلزار ۱۲۰۲ ہجری میں نول کشور کانپور سے شائع ہوئی۔"مولد حسنین ولادتِ سبطین" ۱۳۰۱ ہجری میں مطبع نول کشور لکھنو سے شائع ہوئی۔آپ کی ایک اور تصنیف جو آپ کی خود نوشت ہے "سوانح عمری محمد یوسف خان گلشن آبادی (جاؤرہ والے)" اس کتاب کو ۱۹۹۹ عیسوی میں اے۔آر۔ پرنٹنگ پریس حیدرآباد، پاکستان سے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان نے مرتب کر کے شائع کرایا۔ پیر جی محمد یوسف خان کی کُل ۱۵ مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابیں تحقیق میں سامنے آئیں۔اس کے علاوہ بھی اور کتابیں ہیں جو غیر مطبوعہ ہیں۔اس طرح آپ کُل ۱۵ کتابوں کے مصنف ہیں۔

اسی زمانے میں ایک مصنّف وشاعر سیّد نظام الدین نظام گلشن آبادی اوران کی دونوں ہمشیرہ باکمال شاعرات گذری ہیں۔ نظام گلشن آبادی کی دو نثری تصنیفات ''عقل وشعور'' اور ''عطارد نگار'' منظرِ عام پر آئیں۔علاوہ از ایں آپ کا ایک دیوان الموسوم" ترانہ دلخواہ" (دیوانِ نظامؔ) جو کافی ضخیم ہے، جسے آپ کی وفات کے بعد سرکار نواب افتخار علی خان نے شائع کرایا۔ یہ دیوان جب شائع ہوا یہ دور چوتھے نواب سر محمد افتخار علی خان فرمانروائے جاؤرہ کا دور تھا، جن کے دورِ حکومت میں اردو ادب کو جو ترقّی ملی وہ آج تک دوبارہ عمل میں نہیں آئی۔اس زمانے کے ادبأ و شعرأ کے مقابلے جاؤرہ اس کے بعد آج تک اس زمانے جیسے ایک ادیب یا شاعر پیدا نہیں ہوئے۔ دارالطبع سرکار جاؤرہ کا اپنا ایک علمی وادبی مرکز تھا جہاں مقامی و بیرونی ادیب وشاعر اپنے کلام کی ادبی رسائل میں خوب مشقِ سخن کرتے تھے۔اخبارِ محتشمی یہاں سے نواب غوث محمد خان کے زمانے سے شائع ہوتا تھا جس کے نمونے آج بھی موجود ہیں جو غالباً ۱۸۴۰ عیسوی تا ۱۸۶۵ عیسوی تک شائع ہوئے۔وہی چھاپہ خانہ یہاں آزادی کے بعد تک جاری رہا لیتھو پریس سے اخبار و رسائل شائع کئے جاتے تھے۔اسی چھاپہ خانہ "دارالطبع محتشمی" سے سرکار جاؤرہ سر نواب محمد افتخار علی خان فرمانروائے جاؤرہ نے اپنے نمک خوار محمد لطف علی خاں مہتمم دارالطبع سرکار عالی کو نظام کی شاعری کو ترتیب وار جمع کر کے شائع کرانے کا حکم دیا کیونکہ آپ کی شاعری آپ کی زندگی میں بذریعہ مشاعرے و رسائل ہی منظرِ عام پر آئی تھی اور لوگ آپ کی قابلیت کا اعتراف کرتے تھے،نظام کو ہر علوم و فنون سے رغبت تھی اوران کا زمانہ جاؤرہ کی ادبی تاریخ کا عہدِ زرّیں تھا۔ نواب صاحب بھی آپ کی قابلیت اور علمیت کے حامی اور مدّاح تھے۔ الغرض،آپ کے حکم کی تعمیل ہوئی ۱۹۳۴ عیسوی میں اس کی باقاعدہ اشاعت کی گئی۔

چونکہ آپ ایک صوفی سیّد خاندان کے چشم و چراغ تھ آپ کے والد مولوی امیر الدین کوتوال صاحب بھی عالم و فاضل شخصیت تھے،جاؤرہ کے صوفی بزرگوں میں جنکا نام تھا، اسی لئے صوفیانہ پن ان کے کلام کا ایک بڑا حصّہ ہے۔عشقِ حقیقی کے اشعار آپ کی شاعری میں بہت زیادہ پائے جاتے ہیں۔آپ نے جو اپنی نثری تصنیف "عقل وشعور" کے ایک باب میں شاعر اور شاعری کے بارے میں جو تعلیم فرمائی ہے اسے پڑھ کر آپ کی علمیت اور فنِ شاعری میں مہارت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔اس تصنیف سے ہمیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ فنِ شاعری کی ایک ایک باریکی سے آپ کس حد تک واقف تھے اور شاعری کی ایک ایک صنعت کو آپنے بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔حالانکہ آپ کا مزاج نثری تصنیفات کی طرف مائل تھا،جس کا ثبوت "عقل وشعور" ہے،اس کتاب میں نظامؔ نے ہر موضوع پر لکھا ہے اور یہ تصنیف جاؤرہ اردو ادب کی تاریخ کا وہ ادب پارہ ہے جو ادب کے تمام حلقوں کے لئے مشعلِ راہ ہے۔ یہ کتاب جب شائع ہوئی تو حکومتِ برطانیہ نے نظامؔ کو ۳۰۰۰ روپیہ کا نقد انعام بھی دیا اور اس کی کئی جلدیں لے کر شہر میں لوگوں کو بطور تحفہ دیں اور برٹش لائبریری میں آج بھی اس کتاب "عقل وشعور" کی جلد کو انسائیکلو پیڈیا کے ارتقاء میں شامل کتابوں کے ساتھ رکھا گیا ہے، جو جاؤرہ کے لئے باعثِ فخر ہے،اور اس کے علاوہ آپ کی مرتب کی ہوئی ایک اور تصنیف" باغِ شاداب" بھی دیکھنے کو ملتی ہے اور اس سے آپ کے مزاج و ماحول اور بزرگوں کی صحبت اوران کی فیضیابی سے آگاہی ہوتی ہے۔اس کے علاوہ آپ کی ایک اور تصنیف" عطارد نگار" کا ذکر جاؤرہ کے ادب میں ملتا ہے مگر یہ کتاب نایاب ہے تلاش جاری ہے۔

نظامؔ نے اس زمانے کے کئی شعرأ کو

دیکھا ان کے کلام پر اصلاح دی ان کے کلام پر تاریخیں کہیں۔جاؤرہ کے ایک شاعر فرحتؔ گلشن آبادی جن کا پورا نام انبأ سہائے فرحت تھا آپ فرّخ گلشن آبادی کے شاگرد رشید تھے اور ایسے واحد شاعر تھے جن کا کا دیوان ۸۸۸ اعیسوی میں صرف ۱۸ برس کی عمر میں چھپکر منظرِ عام پر آ گیا تھا۔اتنی کمسنی میں جاؤرہ کے کسی بھی شاعر کا دیوان مکمّل نہیں ہوا۔نظامؔ نے یہاں جو تاریخ کہی ہے وہ تاریخ منظوم نہیں ہے آپ نے نثر مین تاریخ کہی مگر آپ کی نثر جو ہے وہ مُرصّع نثر ہے۔اسی دور میں نظامؔ کی دونوں بہنیں سکندر جہاں بیگم ضیاؔ اور سلطان جہاں بیگم حیاؔ، دونوں بہت اچھّی شاعرات تھیں۔داغؔ دہلوی کا زمانہ تھا اور جاؤرہ گلشن آباد ان دنوں ایک سرسبز وشاداب گلشن کی طرح مہک رہا تھا جن میں انواع و اقسام کے گل اپنی اپنی بہار دکھا رہے تھے ان ہی میں حیاؔ اور ضیاؔ پیش پیش تھیں جو شاعری میں کامِل عبور رکھتی تھیں۔داغؔ سے آپ کی نوک جھونک کے قصّے آج بھی مشہورِ عام ہیں اور آپ دونوں فی البدیع کہتی تھیں آپ کا کافی کلام ہے جو مخطوطات کی شکل میں موجود ہے۔اس زمانہ میں ہز ہائی نیس سرنواب افتخار علی خان بہادر والی جاؤرہ کو حیاؔ اور ضیاؔ کا کلام بہت پسند تھا آپ کا پسندیدہ کلام دارالطبع جاؤرہ" سے مرتّب کر کے شائع کیا گیا تھا،جس میں غالب، مومنؔ، داغؔ جیسے بڑے شعرأ کا کلام بھی شامل ہے ان سبھی کے علاوہ جاؤرہ کے اساتذہ کا کلام بھی اس میں شامل ہے۔اس کتاب کا نام ہے گلدستۂ نضارت "

ہے جو دو طوطوں پر مشتمل ہے دونوں طوطوں میں سب سے زیادہ حیاؔ اور ضیاؔ کے کلام کو شامِل کیا گیا ہے دونوں حصّے آپ کے کلام سے پر ہیں۔اس میں آپ دونوں نے ہر صنفِ سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔حیاؔ اور ضیاؔ کا کلام اس کتاب کے علاوہ چند تذکرات مثلاً "تذکرۂ نسواں" مشاہیرِ نسواں" اور تذکرۂ نسوانِ ہند" کے علاوہ اور کہیں شائع نہیں ہوا نہ ہی ملتا ہے۔علاوہ ازایں ہمیں جاورہ ہی کے بزرگوں کے انتخاب میں دونوں بہنوں کا کلام ملتا ہے کچھ مخطوطات کی شکل میں اور کچھ ڈائریاں ہیں جن میں دونوں کا مختلف کلام درج ہے۔ ۱۸۹۵ عیسوی میں نواب محمد اسمٰعیل خاں کا انتقال ہو گیا اور نواب سر محمد افتخار علی خان تخت نشین ہوئے۔آپ اردو فارسی، ہندی اور اور انگریزی کے بہت اچھّے عالم تھے۔ان کے استاد میاں مسعود بخت تھے جو، استاد سعید بخت صاحب (دہلی والے) جو ایک ماہرِ تعلیم اور خوش نویس تھے ،عمدہ شاعر تھے،آپ نے ٹھمریاں،غزلیات، گیت اور مرثیہ غرضیکہ ہر اصناف پر طبع آزمائی کی،سعید بخت صاحب کے والد تھے آپ بھی اپنے والد کی طرح بڑے جیّد عالم تھے اور خوشخطی میں دور دور تک آپ کی نذیر نہیں ملتی تھی۔استاد مسعود بخت صاحب نے کئی کتابیں لکھیں جو شائع نہ ہوسکیں اور ایک کتاب "ثریّا" کے علاوہان کی تمام تخلیقات دست برد زمانہ ہوگئیں۔

اس دور کے ادبأ وشعرأ میں ایک اور مشہور شخصیت موجود تھی جن کا نام ہے مشرّف یار خان شرفؔ، جو مالوہ میں داغؔ دہلوی کے جاں نشین تھے۔آپ نے اپنے قلمی دیوان کے علاوہ دو تین اور نثری تصنیفات تخلیق کیں۔تاریخ گوئی میں ماہر تھے۔"زراعتِ مالوہ" اور "ڈائمنڈ جوبلی" یہ دونوں نثری کتابیں "دارالطبع محتشمی" جاؤرہ سے شائع ہوئی تھیں۔مشرّف" صاحب کا تذکرہ "لاہور میں شائع ہو چکا ہے۔اس کے علاوہ خم خانۂ جاوید" میں بھی اس وقت کے جیّد شعرأ کی فہرست میں ان کا نام ہے۔آپ کی تصنیفات میں "ڈائمنڈ جوبلی" "اتالیق قیصری" اور "زراعتِ مالوہ" مطبوعہ (۱۸۹۷) ہیں اور "تاریخ ہندوستان" غیر مطبوعہ ہیں۔شرفؔ کا شاعری میں اپنا ایک الگ مقام ہے اور نثر میں بھی آپ منفرد نظر آتے ہیں۔رتلام سے شائع ہونے والا ایک گلدستہ جس کا نام گلشنِ داغؔ تھا اور "افتخار" جو جاؤرہ سے شائع ہوتا تھا ان گلدستوں میں تواتر سے شرفؔ کا کلام چھپتا رہا۔آپ داغ دہلوی کے شاگرد رشید تھے اور ایک مرتبہ اتفاقاً اپنے ماموں زادے بھائی اختر یار خاں شبابؔ کی شادی میں دہلی گئے۔حضرت داغؔ دہلوی کے دولت کدے پر پہنچے۔عنقریب مشاعرہ ہونے والا تھا اس مشاعرے میں شرفؔ کے داد دینے کے انداز سے داغؔ نے آپ سے سوال کیا کہ للّٰہ جلد بتایئے آپ کہاں سے آئے ہیں؟ شرفؔ نے قدم بوس ہوکر اپنا تعارف کرایا داغؔ نے آپ کو گلے سے لگا لیا۔پھر آپ کو با قاعدہ شرفِ تلمذ بخشا۔جب استاد داغؔ حیدرآباد (دکن) تشریف لے گئے اور ں نظام میر محبوب علی خاں آصفؔ والئ حیدرآباد کے مقرّر ہو گئے اس وقت داغؔ نے اپنے شاگردانِ مالوہ کو لکھا کہ شرف سے اپنی غزلیات پر اصلاح لے لیا کریں اور ساتھ ہی شرفؔ کو" وقارالاعظم" کا خطاب عنایت کیا۔شرفؔ کے تمام خطوط تلف ہوگئے مگر "انشائے داغؔ" میں شرفؔ گلشن آبادی کے نام دو خطوط ملتے ہیں۔

آفاق احمد زاہدیؔ ایک مورّخ کی حیثیت

سے سامنے آتے ہیں اور اپنی تصنیف ''تاریخ جاؤرہ'' کو اتنے خوبصورت انداز سے پیش کرتے ہیں گویا آپ نے ۱۸۴ صفحات میں ؒ کوزے میں سمندرؒ کی طرز پر جاؤرہ کی ۱۸۰۸ عیسوی سے لیکر 1947 عیسوی تک کا حال بہت منظّم طریقے سے درج اوراق کیا ہے، اس کتاب کو حسبِ فرمائش عالی جناب خان بہادر سیّد بنیاد حسین صاحب ،ایم۔بی۔ای۔ چیف منسٹر و ڈائریکٹر تعلیمات ریاست جاؤرہ، مرتّب کیا اس کتاب کو بھی دارالطبع محتشمی دربار جاؤرہ سے ہی شائع کیا گیا۔سرکار نواب افتخار علی خان نے اس تاریخی کتاب کو اس ریاست کے طلباؑ کے تعلیمی نصاب میں شامل کئے جانے کا حکم نافذ فرمایا۔تاکہ ریاستی طلباؑ کے دل میں اپنے وطن کی وقعت ومحبت اور فرمانرواؤں کی عظمت وحرمت کا جذبہ پیدا ہو۔اگر یہ تاریخ تصنیف نہ ہوتی تو ریاست کے طلباؑ اپنی ریاست کے حالات سے قطعی نابلد اور ناواقف رہ جاتے اسی کمی کو پورا کرنے کے لئے چیف منسٹر صاحب کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے مورخ اشفاق حسین زاہدیؔ نے اس فرض کو نہایت جانفشانی سے پورا کیا جس میں آپ کی تلاش اور مستند تواریخ سے آپ نے استفادہ کیا اور اپنے اخی مکرّم جناب مشتاق احمد صاحب زاہدیؔ بی۔اے۔(علیگ) سابق پرنسپل ایجرٹن کالج بھادلپور، نیز دیگر ماہرانِ تعلیم سے وقتاً فوقتاً استفادہ کرکے ایک ایسی تاریخی تصنیف پیش کی جو مفید عام اور یادگارِ زمانہ ثابت ہوئی ،اور آج بھی گلشن آباد جاؤرہ کے لوگ اور خاص طور پر طلباؑ اس سے حسبِ ضرورت مستفیض ہوتے ہیں۔

اس زمانہ میں شائع ہونے والے گلدستے و رسائل میں اس دور کے جن شعراؑ و ادباؑ کا کلام متواتر شائع ہوا ان میں گلشن آباد جاؤرہ کے سیّد ابنِ علی محشرؔ، صاحبزادہ محمد اشرف علی خاں، حافظؔ، شبابؔ گلشن آبادی، تلمیذ داغؔ و حسرتؔ، شیخ کریم بخش برگؔ مولانا عبدالحق بیدلؔ (ملک الشعراؑ و مدیر افتخار) منشی فیّاض الدین انجمؔ تلمیذ مولانا بیدلؔ، منشی لطف علی خان عیشیؔ و سہیلؔ تلمیذ بیدلؔ، حبیب احمد میکشؔ تلمیذ بیدلؔ، شیخ عبدالغفور ابر، تلمیذ بیدلؔ، محمد موّ رشاہ خان طالب تلمیذ بیدلؔ، حافظ غلام حیدر خان نقشبندی مائلؔ تلمیذ بیدلؔ، سیّد یاور علی یاورؔ تلمیذ بیدل، منشی شیر علی خاں چشتی افسرؔ تلمیذ جگرؔ، سیّد ہدایت علی موجؔ، رحیم زاد خان شیدائیؔ، تلمیذ شرفؔ، منشی محمد یوسف کوکب تلمیذ بیدلؔ، میرزا قاسم بیگ قاسمؔ، سیّد احمد سلیمان ساغرؔ، محمد اکرم خان، فرخ گلشن آبادی، انباؔ سہائے فرحتؔ تلمیذ فرّخؔ گلشن آبادی، صاحبزادہ ڈاکٹر عبدالواجد خان (چیف منسٹر ۸۳۹۱ تا ۱۴۹۱) بی۔اے۔(علیگ) ولایت سے پی ایچ۔ڈی۔ تھے انگریزی اور اردو ادب میں کامل دستگاہ حاصل تھی۔ایک اور استاد مولوی احتشام الدین حقی، ایم۔اے۔(علیگ) جو شاہ عبدالحق محدث دہلوی کی اولاد میں تھے،اور جیّد عالم بھی تھے۔آپ کے کے والد مولوی انوارالحق ایجینٹ گورنر جنرل راجپوتانہ کے فارسی دفتر میں میر منشی تھے،احتشام الحق صاحب کئی علمی کتابوں کے مصنّف ہیں۔نظام گورنمنٹ نے ان ہی سے مکمّل فرہنگ اردو تیار کرائی۔آپ نواب افتخار علی خان بہادر کے فرزندان کے اتالیق بھی رہے۔ایک اور ہستی جنہوں نے اتالیقی کا کام انجام دیے تھے نورالرحمن صاحب بی۔اے۔ادیب جرنلسٹ اردو ،فارسی وعربی کے منتہی عالم،آپ تقریباً ڈھائی سال اتالیق رہے، بعد میں کلکتہ چلے گئے وہاں بھی مسلم چیمبر آف کامرس کے سکریٹری رہے اور اس کے بعد آل انڈیا چیمبر آف کامرس فیڈریشن کے سپروائزنگ مینیجر بھی رہے۔ان کے بعد کے اساتذہ میں جو نام قابلِ ذکر ہیں ان میں ۱۹۱۱ عیسوی میں ایک شاعر کا دیوان منظرِ عام پر آیا وہ ہیں عالمگیر خان عالمؔ اور آپ کے مجموعۂ کلام کا نام ہے''دیوانِ عالم''الموسوم''بمذاقِ عشق'' جو ۱۱۳۱ ہجری میں در مطبع فخر نظامی واقع حیدرآباد دکن سے طبع ہوا۔صاحبزادہ عالمگیر خان عالمؔ خلف الصدق عالی جناب کپتان نیاز محمد خان صاحب تھے اور آپ حیدرآباد دکن کے مشہور شاعر حضرت حبیبؔ نثوری کے شاگردِ رشید تھے۔آپ نے اپنے استاد کی شاگردی اختیار کرنے کے دو برس بعد ہی اپنا دیوان مرتّب کرلیا استاد صاحب بھی آپ کی قابلیت کا لوہا مانتے تھے جاؤرہ سے میلوں دور رہ کر بھی انہوں نے اپنے اس دیوان کو اپنے شہر گلشن آباد کے نواب ہز ہائینس نواب افتخار علی خان بہادر صولت جنگ کو نذر کیا اور وفا پرستی اور حبّ الوطنی کا ثبوت دیا،اور''مذاقِ عشق''کو نواب صاحب کے نام سے معنون کیا۔تقریباً ۲۰۰ صفحات پر مشتمل یہ دیوان آج بھی جاؤرہ میں میرے پاس موجود ہے سرورق کے اندرونی ورق میں پہلا اور آخر صفحہ سونے کے پانی سے زرّین ہے اس دیوان میں ہر صنفِ سخن پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔بڑے بڑے شعراؑ نے تقریظ و تاریخیں کہی ہیں ہر کلام سادگی سے بھرا ہے جو آپ کی شاعری کا خاص عنصر ہے۔

ایک اور درباری شاعر ہیں محمد نور خان تخلّ بیدلؔ، اردو اور فارسی پر دسترس حاصل تھی اور شاعری سے فطری مناسبت تھی، آپ حضرت ظہیر دہلوی جن کا خطاب طوطیؔ ہند تھا اور حضرت ذوقؔ دہلوی کے شاگرد رشید تھے۔ داغؔ دہلوی کے ہمعصر تھے۔ آپ نے اپنے اساتذہ کی معیت میں شعر وسخن کی منازل طے کر کیا پنے ہمعصروں میں بلند مقام حاصل کیا۔ آپ کے شاگرد شعرأ حضرت بیخودؔ دہلوی، نوحؔ ناروی، سیمابؔ اکبرآبادی اکبر حسین اکبرؔ چشتی نبیرہ، حضرت خواجہ معین الدین چشتی سنجریؔ تھے۔ منشی کفایت اللہ کفایت لاجوابؔ شاعر اور دورِ جدید کے مشہور شاعر غلام ربّانی خطیبؔ کے والد ماجد تھے جن کا کلام آج بھی موجود ہے اور مولوی احمد علی شاعر جو شرعی قانون کے عالم فاضل تھے اور آپ اسلامی عدالت کے منصف بھی تھے علاوہ ازیں آپ کا دیوان الموسوم" بادۂ کہن" آپ کی وفات کے بعد ۲۰۰۸ منظرِ عام پر آ چکا ہے۔ اس دیوان کو آپ کے فرزند واحد صاحب نے مرتّب کیا ہے، اور اس کا پیش لفظ پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی نے تحریر کیا ہے۔ مولوی احمد علی صاحب اس نسل سے تعلق رکھتے تھے جو صدیوں کی بندھی ہوئی روایات اور ان کی اقدار کے پاسدار تھے۔ شعر و شاعری تو یوں بھی اردو کلچر کا ایک لازمی حصّہ ہی ہے لیکن ایک زمانہ تھا کہ ہر پڑھے لکھے شخص کے آزمائش اس پیمانے پر پورا اترنے سے ہوتی تھی کہ وہ اپنے افکار و خیالات اور عقائد کے اظہار کیلئے اور طریقوں کے علاوہ شعر و شاعری میں کتنا کمال دکھاتا ہے۔ اس نسل نے اپنے افکار و خیالات کا بڑا حصّہ اسی شکل میں چھوڑا ہے۔ احمد علی صاحب کا زمانہ وہ تھا جب سر سیّد احمد خاں کی تہذیب کے اثرات پوری دنیائے علم پہ چھائے ہوئے تھے۔ شاعری میں حالیؔ کا طرز عموماً اس لئے مقبول تھا کہ اس کے ذریعے پڑھے لکھے لوگوں کے ایک بڑے حلقے تک پیغام پہنچایا جا سکتا تھا۔ پھر خواہ جذباتِ عاشقانہ ہوں یا مصلحانہ، سادگی بیان میں جو ایک جادو تھا، جسے داغؔ دہلوی اور ان کے دبستان کے لوگوں نے دریافت کیا اور ساتھ ہی اسے بہت فروغ بھی دیا اور اس کی مقبولیت بھی عام تھی۔ چنانچہ مولوی احمد علی مرحوم اپنی ان روایات کے پہلوؤں سے ذہنی طور پر زیادہ قریب تھے، جن کا اظہار مولوی صاحب کے شعری مجموعہ میں جابجا نظر آتا ہے۔ آپ ایک صوفیانہ مزاج کے شاعر و ادیب گذرے ہیں۔ آپ کے بیٹے الگ الگ ممالک میں ملازمت کے سلسلے میں چلے گئے مگر ان کے خاندان کے ان افراد نے کافی طویل عرصہ بیرونِ ممالک میں گذارنے کے بعد بھی اپنے والد مولوی صاحب کے اس قیمتی کلام کی اہمیت کو سمجھا اور اسے بھلایا نہیں بلکہ اس کی اشاعت کا بڑے قرینے کے ساتھ اہتمام کیا اور اسے ۲۰۰۸ عیسوی میں خصوصاً سیّد عبدالواحد (ع۔ واحد) صاحب نے بڑی جانفشانی سے مرتّب کر کیاس مجموعہ کا صیلا آفسیٹ پرنٹنگ پریس" معیار پبلیکیشنز" دہلی سے شائع کرایا ورنہ یہ قیمتی کلامِ مولوی صاحب بھی تلف ہو جاتا۔ اس مجموعہ میں مناجات، غزلیاتِ اردو، کلامِ فارسی، حمد، نعت، نعتیہ غزلیات، منقبت، خطباتِ منظوم برائے جمعتہ الوداع رمضان مبارک، منظوم خطوط، قصائد، رباعیات، قطعات، قطعاتِ تاریخی وغیرہ غرضیکہ ہر صنفِ سخن پر طبعآزمائی کی ہے۔ ان تمام تخلیقات کو یہاں تک کہ کچھ گمشدہ و ناتمام کلام کو بھی اس مجموعہ میں محفوظ کر دیا ہے۔ ع۔ واحدؔ جو مولوی احمد علی صاحب کے صاحبزادے ہیں آپ بھی منظومات کے بہترین شاعر ہیں ایک مجموعہ کلام ۵۸۹۱ عیسوی میں" لندن کی دوسری شام" شائع شدہ ہے اور دوسرا مجموعہ" رقِ شرر" ۴۰۰۲ عیسوی میں عمران پبلی کیشنز کراچی سے شائع ہوا ہے ع، واحدؔ اس وقت ترکی میں موجود تھے۔ کلام بہت اعلیٰ منظومات کا مجموعہ ہے اور جلتی ہوئی آگ سے جس طرح کوئی چنگاری رقص کرتی ہوئی اٹھکر فضأ میں گم ہو جاتی ہے بس یہی رقِ شرر" شاعر کی کل متاع ہے۔ اور یہی وہ شرارے ہیں جو قارئین کے ذہنوں کو ہر ایک نظم سے اٹھکر ضوفشاں کرتے ہیں، اور یہی شاعر کی شاعری کی کامیابی ہے جسے آپ نے منظومات کی شکل میں ہمیں عطا کیا ہے۔

بیسویں صدی کے ربعِ دوم میں اردو ادب کو پروان چڑھانے والے جو شعرأ و ادبأ ہیں ان میں وجیہ الدین ابر، حکیم بہاالدین، خواجہ اکبر حسین اکبرؔ، اختر حسین اخترؔ، خلف الصدق لسان العصر نقّادِ سخن خواجہ اکبر حسین اکبرؔ، خادم الشعرأ محمد عمر خاں بازغؔ تلمیذ حضرت بیدلؔ افتخاری، متین الدین خان متینؔ گلشن آبادی تلمیذ علامہ سیمابؔ اکبرآبادی جن کی شاعری کو سیمابؔ بہت پسند فرماتے تھے آپ کی ایک غزل کے اشعار سن کر سیمابؔ نے متینؔ کے ذوق اور فکرِ شاعری کی تعریف و توصیف کی اور ان کے عظیم شاعر ہونے کی پیشین گوئی کی اور سیمابؔ نے جاؤرہ میں ایک مشاعرہ میں متینؔ کی ایک غزل سن کر کہا تھا" اس عمر میں فکر کا یہ عالم ایسا لگتا ہے یہ

نوجوان شاعر یا تو دیوانہ ہو جائے یا بہت ممکن ہے کہ مر جائے۔" اور یہ پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی اور کچھ عرصہ کے بعد ہی واقعی آپ پر جنون کی کیفیت طاری ہوگئی۔اور اسی جنون کی کیفیت میں آخر تک مبتلا رہے طویل سجدوں میں رہتے خدا کے حضور میں ہر وقت دعا گو رہتے یہ حال تھا کہ آخر وقت میں ناک پوری طرح سے گھس چکی تھی اور آواز ناک سے نکلتی محسوس ہوتی تھی جاؤرہ میں گانے والی تھیں بشیراً اور لالہ دونوں کو کلام لکھ کر دیتے تھے کہ یہ غزل گا کر سناؤ۔قلم آخر تک ہاتھ سے نہیں چھوٹا۔متینؔ ہارمونیم، ستار اور سارنگی وغیرہ کئی سازوں کو بجانا جانتے تھے اپنے مصطفیٰ کمال پاشا کی وفات پر ایک قصیدہ لکھ کر ترک کے کسی رسالہ میں ارسال کیا تھا اور اوّل انعام تو حاصل کیا ہی، اس کے علاوہ وہاں سے آپ کو بذریعہ خط وہاں کے بادشاہ نے دعوت دیکر بلایا تھا۔آپ کے اشعار آج بھی لوگوں کو زبانی یاد ہیں۔

متینؔ کے ہی ہمعصر ایک اور شاعر صاحبزادہ سلطان حامد خان ثروتؔ تلمیذ سیمابؔ اکبرآبادی اور ان کے انتقال کے بعد حضرت ساحلؔ سعید ٹونکی سے اصلاح لیتے رہے، آپ جاؤرہ کے ایک معزّز خاندان سے تعلق رکھتے تھے آپ صاحبزادہ سلطان محمود خان جاگیردار (نیمن اور ناگدی) کے پسر تھے اور صاحبزادہ سلطان محمود خان رشتے میں نواب افتخار علی خان والیِ ریاست جاؤرہ کے چچازاد بھائی تھے۔ثروتؔ قابل شخصیت کے مالک، سیاسی طور پر آپ کانگریس کے نمایاں لیڈر رہے۔شعر و شاعری کی محفلوں کے روح رواں رہے۔۱۹۶۰ اور ۷۰ عیسوی کے عشرے میں گلشن آباد کی ادبی سرگرمیوں کو فروغ دینے میں آپ کا نہایت اہم حصہ ہے۔ پسندیدہ صنف غزل تھی۔زبان صاف، سادہ اور بامحاورہ اور روزمرّہ کا آئینہ تھی۔نواب صاحب کا چھاپہ خانہ لیکر جاری رکھنے کی کوششیں کرتے رہے اور اسی چھاپہ خانہ سے اپنی نگہبانی میں اردو روزنامہ "پکار" کا اجرا کیا، وسائل کی کمی کے باوجود مقامی اور آس پاس کی خبریں حالات پر تبصرے، جائزے، اور غزلیات شائع ہوتی رہیں۔یہ سلسلہ کافی عرصہ تک چلا لیکن شعر و شاعری کی محفلیں گرم رہیں، اردو کی ترقّی و توسیع کے لئے آپ کی کوششیں جاری رہیں۔شہر کا بھی اسلامیہ اسکول آپ کی نگہبانی میں جاری رہا جو آج بھی جاری ہے اس زمانے میں ماسٹر سعید گلشن آبادی نے اسکول کے چلانے کی خاطر اپنی ساری زندگی اردو کی خدمات کے لئے وقف کردی آپ خود بھی عمدہ شاعر تھے۔ادیب ماہر اور کامل (علی گڈھ) مرکز یہاں آپ ہی نے قائم کیا جو تقریباً ۲۰۰۵ تک چلتا رہا۔

صاحبزادہ سلطان محمد خان سلطان حامد خان کے اکلوتے چھوٹے بھائی تھے، انہوں نے ابتدائی تعلیم ہائی اسکول جاؤرہ سے حاصل کی۔سینئر کیمرج، سینٹ اسٹیفن اسکول دہلی سے پاس کیا اور گریجویشن الہ آباد یونیورسٹی سے کیا اس کے بعد انہیں برٹش انڈین آرمی کمیشن مل گیا۔تقسیم ہند کے وقت جب وہ میجر کے عہدے تک پہنچ گئے تھے اس وقت پاکستان چلے گئے جہاں انہیں وزارتِ خارجہ کے لئے منتخب کرلیا گیا اٹلی، مصر، ترکی، برطانیہ اور چین میں مختلف عہدوں پر فائز رہنے کے بعد انہوں نے کینیڈا، چین، جاپان اور دو مرتبہ امریکہ میں بطور سفیر پاکستان کی نمائندگی کی۔اسی دوران وہ سکریٹری وزارتِ خارجہ جیسے اعلیٰ ترین عہدے پر بھی فائز رہے۔آپ کی شادی نوابزادی عابدہ سلطان (دختر نواب افتخار علی خان) سے ہوئی تھی آپ جاؤرہ کے چوتھے نواب صاحب کے داماد تھے۔آپ کو اردو، فارسی، انگریزی اور کئی غیر ملکی زبانوں پر عبور حاصل تھا اتنے ذمہ دار عہدوں کے فرائض کو انجام دیتے ہوئے بھی آپ نے اپنی تحریری صلاحیت کا مظاہرہ کیا اور ایک کتاب تصنیف کی جو اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں شائع ہوئی کتاب کافی ضخیم ہے اس کا موضوع ان تمام ملکوں کی کارگذاریوں اور مختلف عہدوں کی یادوں سے وابستہ ہے جس کا انگریزی نام درج ذیل ہے جسے اردو میں بھی شائع کیا اور انگریزی میں بھی۔

Memories and reflections of A Pakistani Diplomat

۱۹۸۴ عیسوی کے بعد جاؤرہ کے شعر و شاعری کے محدود دائرے کو اردو نثر اور صحافت سے جوڑنے کی کوشش کی اور اس شخصیت کا نام تھا عزیز الرحیم خان المتخلّ بہ عشرتؔ گیلانی مرحوم فارسی، اردو اور انگریزی کے قابل اساتذہ میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔جملہ اصناف پر قدرت حاصل تھی لیکن خاص طور پر آپ کا رجحان رباعیات پر تھا۔آپ نے مالی کمی کے باوجود مذکورہ بالا چھاپہ خانے میں "المعین" رسالہ کا اجرا کیا اس میں آپ کے ساتھ ثروت گلشن آبادی اور سیف گلشن آبادی پیش پیش رہے۔اس رسالہ میں تحقیقی، ادبی اور تاریخی مضامین شائع ہوتے تھے۔آپ کے اور دیگر مضامین سے

معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو نظم کے ساتھ ساتھ نثر پر بھی کمال قدرت حاصل تھی۔"المعین" میں شعراً کا منتخب کلام شائع ہوتا تھا۔"لطیف ندرتیں" کے اداریہ میں آپ کے شاگرد عبداللطیف ندرتؔ رتلامی نے آپ کی قادرالکلام شخصیت کا ذکر نہایت عقیدت کے ساتھ سپردِ قلم کیا ہے۔

۱۹۵۲ عیسوی کے آس پاس عشرتؔ کے صاحبزادے غیاث الرحیم شکیبؔ کی کچھ طنز و مزاح سے متعلق کلام"شعلہ و شبنم" دہلی سے شائع ہوئے اس کے بعد پھر خموشی۔سالوں کے وقفہ کے بعد نثری اعتبار سے پچھلے آٹھ دس سالوں سے شکیبؔ ادبی رسالوں میں پھر سرگرمِ عمل نظر آرہے ہیں۔آپ کی طنز و مزاح کی تحریریں بہت سیر سالوں مثلاً"قفلِ صنم" دہلی، اردو اکیڈمی بھوپال کے سہ ماہی"تمثیل"،"زادِ سفر" بمبئی، ماہنامہ قرطاس ناگپور سہ ماہی"کاروانِ ادب" بھوپال، حدیثِ دل" دہلی،"النداً" سہ ماہی احیّین، ماہنامہ "انشا" کلکتہ، ماہنامہ" بیباک" مالیگاؤں، ماہنامہ" پالیکا سماچار" نئی دہلی، ماہنامہ"کتاب نما" نئی دہلی، ماہنامہ ضیاؔ و جیہ" رامپور، ماہنامہ"قفلِ صنم" دہلی وغیرہ ادبی رسائل میں بھی مطالعہ میں آرہی ہیں۔جن میں انشائیہ، منظومات، غزلیات، دوہے، مراثی و قصائد، نعت و منقبت اور کئی شخصیات پر تعارفی مضامین غرضیکہ ہر صنفِ ادب پر آپ نے قلم اٹھایا اور کامیابی کے ساتھ آج بھی اس میدانِ ادب میں فعال ہیں اور نثر کے میدان میں آج بھی اپنے قلم کے ساتھ تنہا سرگرمِ عمل ہیں۔کچھ قابلِ ذکر ہستیاں ہیں جن کا ذکر ضروری ہے۔ ان میں شفیعؔ گلشن آبادی بڑے ذودگو استاد شاعر گزرے آپ یہاں کی ادبی روایات اور معاملہ بندی سے بندھے ہوئے جاؤرہ کے درباری شاعر حضرت بیدلؔ گلشن آبادی کے تلامذہ میں شامل تھے اس سے پہلے شفیعؔ حکیم احسنؔ کے شاگرد تھے احسنؔ کی وفات کے بعد آپنے بیدلؔ سے شرفِ تلمذ حاصل کیا۔آپ کا کلام تصوّف

غلام ربّانی خطیب گلشن آبادی جب تک آپ حیات رہے اردو کے لئے آپ ہر طرح سے پیش پیش رہے آپ کا دم غنیمت تھا اردو مشاعرے، رسائل، شاعری، اردو، فارسی تعلیم کی کلاسیں، خطّاطی کی تعلیم، غرضیکہ ہر طرح کی اردو سے جڑی کارروائیاں جاری وساری رہیں آپ کو شاعری کی جملہ اصنافِ سخن پر عبور حاصل تھا۔ آپ زود گو شاعر تھے۔اُپ کو اردو، فارسی، عربی اور انگریزی زبانوں پر عبور حاصل تھا اور آپ کا مطالعہ بڑا وسیع تھا ہر وقت مطالعہ میں مصروف رہتے تھے۔خطّاطی میں آپ کا کوئی ثانی نہیں تھا۔جاؤرہ میں جتنے تحقیقی کام پروفیسر عبدالباقی صاحب، پروفیسر وسیم الدین صاحب، پروفیسر فہمیدہ منصوری صاحبہ غرضیکہ ہر زمانے میں معشوق علی خان کے بعد اکیلے خطیب صاحب نے تمام مقالات کی کتابت کی اور انہیں ترتیب دیا۔زبان و بیان پر بھرپور قدرت حاصل تھی۔ہزار ہا غزلیں کہہ چکے تھے آپ کا کلام چار مجموعوں میں شائع ہو چکا ہے سب سے پہلے"قطرہ قطرہ خون" (۱۹۹۲) مشاہدہ"(۲۰۰۱) نذرانہ" (۲۰۰۲) محامد باری تعالیٰ" (۲۰۰۳) منظرِ عام پر آچکے ہیں۔

اور عشقِ رسولؐ سے پر ہے، تاریخ گوئی میں ایسی مہارت کہ ایک ساتھ چار چار تاریخیں کہہ دیں، فصلی ہجری، سمّت، عیسوی وغیرہ تاریخیں ایک ہی تاریخ میں نکال دیں، غرضیکہ آپ جیسا تاریخ کہنے والا آپ کے بعد آج تک کوئی نہیں ہوا آپ تاریخی نام بھی فوراً راستے میں چلتے ہوئے نکال دیتے تھے۔شفیعؔ نے غزل، نظم، قصیدہ، مرثیہ، تضامین، رباعی، قطعہ غرضیکہ ہر صنفِ سخن پر طبع آزمائی کی۔شفیعؔ کا اپنا منفرد اندازِ بیان ہے، آپ کا کلام مسوّدات کی شکل میں آپ کے بیٹے رفیعؔ گلشن آبادی کے پاس موجود ہے، رفیعؔ بذاتِ خود ایک بہت عمدہ شاعر ہیں آپ کے کلام کا رنگ شفیعؔ سے جدا ہے۔

مرزا محمود بیگ قمرؔ گلشن آباد کے ایک شاعر تھے، آپ شاعر تو تھے مگر اردو ادب کی خدمت کا جذبہ ان میں غضب کا تھا حالانکہ آپ نابینا تھے۔جوانی میں آنکھیں ساتھ چھوڑ گئیں تھیں مگر حافظہ غضب کا پایا تھا۔ایسی حالت میں بھی بچوں کو پڑھایا کرتے تھے اور جو کچھ آمدنی ہوتی تھی مشاعروں پر خرچ کر دیتے تھے۔ہر مہینے آپ کے گھر پر ایک مشاعرہ ہوتا تھا اور سال بھر میں ایک بڑا مشاعرہ ان کے بھتیجے شاہ رخ مرزا کی سالگرہ کے موقع پر ہوتا تھا جس میں مقامی شعراً کے ساتھ بیرونی شعرا بھی موجود ہوتے تھے۔آپ جب تک حیات رہے یہ سلسلہ قائم رہا۔ان مشاعروں کا ریکارڈ بھی جاؤرہ میں موجود ہے۔اس زمانے میں ان گنت شعراً موجود تھے، جن کی فہرست کافی طویل ہے زیادہ تر مرحوم ہو چکے۔اللہ مغفرت فرمائے، آمین۔

غلام ربّانی خطیب گلشن آبادی جب تک آپ حیات رہے اردو کے لئے آپ ہر طرح سے پیش پیش رہے آپ کا دم غنیمت تھا اردو مشاعرے، رسائل، شاعری، اردو، فارسی تعلیم کی کلاسیں، خطّاطی کی تعلیم، غرضیکہ ہر طرح کی اردو سے جڑی کارروائیاں جاری وساری رہیں آپ کو

شاعری کی جملہ اصنافِ سخن پر عبور حاصل تھا۔آپ زود گو شاعر تھے۔اُ پ کو اردو ،فارسی،عربی اور انگریزی زبانوں پر عبور حاصل تھا اور آپ کا مطالعہ بڑا وسیع تھا ہر وقت مطالعہ میں مصروف رہتے تھے۔خطّاطی میں آپ کا کوئی ثانی نہیں تھا۔جاؤرہ میں جتنے تحقیقی کام پروفیسر عبدالباقی صاحب ،پروفیسر وسیم الدین صاحب، پروفیسر فہمیدہ منصوری صاحبہ غرضیکہ ہر زمانے میں معشوق علی خان کے بعد اکیلے خطیب صاحب نے تمام مقالات کی کتابت کی اور انہیں ترتیب دیا۔زبان و بیان پر بھرپور قدرت حاصل تھی۔ہزار ہا غزلیں کہ چکے تھے آپ کا کلام چار مجموعوں میں شائع ہو چکا ہے سب سے پہلے"قطرہ قطرہ خون"(۱۹۹۲)"مشاہدہ"(۲۰۰۱) نذرانہ"(۲۰۰۲) محامد باری تعالیٰ"(۲۰۰۳) منظرِ عام پر آچکے ہیں اور ایک اور مجموعہ کو منظرِ عام پر لانے کی تیّاری ہے۔آپ نے پہلے نادان طیفوری کی شاگردی اختیار کی بعد میں شاداں اندوری سے اصلاحِ سخن لینے لگے۔وفات کے وقت آپ کی عمر ۹۵ سال سے تجاوز کر گئی تھی اور آپ اپنی کبرسنی کی وجہ سے گوشہ نشین ہو گئے تھے مگر مشقِ سخن اور اصلاحِ سخن برابر آخر دن تک جاری رہی۔کبھی کبھی مشاعروں میں بھی شرکت کرتے تھے اور اپنے گھر کے صحن میں منعقدہ مشاعروں میں بڑے ذوق وشوق سے شرکت فرماتے تھے۔

مرزا غفّار بیگ اثر گلشنؔ آبادی بھی اسی زمانے میں ادبی اور سیاسی محفلوں کے روح رواں رہے لیکن عمر کے آخر دور میں ماحول کو دیکھتے ہوئے خاموشی اختیار کر لی پہلے بیدلؔ افتخاری کے شاگرد رہے، بعد میں شاداں اندوری کے شاگردِ رشید میں شامل ہو گئے۔آپ کی شعر گوئی کلاسیکل انداز کی ہے، ہر شعر میں شائستگی اور پختگی ہے۔ان کے یہاں زندگی اور زمانے کے تقاضوں اور اردو کی ادبی و شعری روایات کا حسنِ خوبی غزلیات میں سموئی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔

جاؤرہ میں اردو کی ترقّی ترویج کے سلسلے میں پروفیسر وسیم الدین کا ذکر نہ کرنا انتہائی نا سپاسی ہوگی جنہوں نے اسکول سے لیکر یونیورسٹی تک جاؤرہ سے اعزّین ، امراؤتی مہاراشٹر، علی گڑھ وغیرہ تک رسائی کی اور آج جاؤرہ میں جو ایم۔اے۔تک اردو پڑھائی جا رہی ہے آپ ہی کی مرہون منّت ہے اور وہ نام ہے پروفیسر وسیم الدین صاحب آج جاؤرہ میں جتنے سرکاری یا غیر سرکاری اساتذہ موجود ہیں آپ کے شاگرد ہیں۔جاؤرہ میں ادیب، ماہر، کامل کا مرکز آپ ہی نے جاؤرہ کے اسلامیہ اسکول میں قائم کرایا۔آپ بڑے زود گو شاعر تھے آپ کے گھر پر بہت قابل لوگوں کی مجالیس ہوا کرتی تھیں۔اردو، عربی، انگریزی زبانوں پر آپ کو پورا عبور حاصل تھا۔اپنے تمام شاگردوں کو گھر پر بھی تمام زبانوں کی تعلیم دیا کرتے تھے۔بے حد مزاحیہ مگر بڑی انٹلیکچوئل گفتگو آپ اپنے ساتھیوں سے اور اپنے شاگردوں سے کرتے تھے۔آپ کی شاعری میں غزلیات، منظومات، قطعات، رباعیات وغیرہ موجود ہیں کلام مسوّدات کی شکل میں ہے۔ جو آج تک شائع نہیں ہوا۔

سلاست، روانی، سادگی اور صداقت آپ کے کلام میں صاف نظر آتی ہیں۔آپ ایک حسّاس دل انسان ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بالغ النّظر شاعر تھے۔آپ کا مجموعۂ کلام"چراغ کی لوٗ" ۱۹۸۹ میں نوری پریس ناگپور سے شائع ہوا، جس کے ناشر ڈاکٹر ندیم الرحمن خاں ندیمؔ ناگپوری ہیں۔اس مجموعہ میں حمد، نعت، منقبت۔غزلیات، منظومات، قطعات اور متفرق اشعار شامل ہیں۔ اسی زمانہ کے ایک اور کہنہ مشق شاعر سیف الدین سیفؔ گلشن آبادی علی گڈھ سے انہوں نے تعلیم حاصل کی وہ دور مجازؔ، نیازؔ، رشید احمد صدیقی، پروفیسر آلِ احمد سرور جیسے اساتذہ کا دور تھا آپ جاؤرہ میں پہلے خستہؔ صاحب کے شاگرد رہے آپ کے ترکِ وطن کے بعد نازؔ مالوہ حکیم حضرت شاداںؔ اندوری کے حلقہ تلامذہ میں شامل ہو گئے۔ اس زمانہ میں جاؤرہ ریاست میں بھی ادبی و تہذیبی ماحول تھا اور میرزا عظیمؔ بیگ چغتائی، عصمتؔ چغتائی، شرفؔ، اکبرؔ، اور استاد بیدلؔ جیسے عظیم فنکار اس شہر میں موجود تھے، ایسے ادبا و شعرا کی موجودگی اس شہر کی عظمت کے آئینہ دار تھی۔نواب افتخار علی خان کی ادب سے وابستگی نے اس چھوٹی سی ریاست کو گہوارۂ ادب بنا دیا تھا۔بوہرہ قوم کی تہذیب آپ کی رگ و پے میں شامل ہونے کے باوجود آپ اردو ادب کی طرف بے حد راغب تھے۔آپ اپنی سیاسی و سماجی مصروفیات کے با وجود مسلسل اردو ادب کی خدمت کرتے رہے۔بڑے پرخلوص اور منکسرالمزاج انسان ہیں۔آپ ادب میں دام، درہم، قدم، زنِ متواتر اردو ادب کی ترقّی کے لئے کوشاں رہے۔آپ نے زندگی کے صفحات پر کبھی آنسو کبھی کسک اور کبھی خونِ جگر کی اور درد کے ساتھ شعر و سخن کی بڑی خوبصورتی کے ساتھ تصاویر اتاریں اور اپنے ذاتی تجربات کو عالمگیری تجربات بنا دیا۔آپ کا پہلا مجموعہ

''ندائے سیف'' ہے اور دوسرا ''مجموعہ سلام'' ہے اور تیسرے مجموعہ مرتّب کر رہے ہیں۔آپ اس البرسنی میں بھی شعر کہتے ہیں مشاعروں میں شرکت اب نہیں کرتے۔درس و اصلاح کا کام بھی جاری و ساری ہے۔ باقیاتِ صالحات میں چند لوگوں میں آپ دو چار لوگ ہی ہیں جو آج بھی ماشاء اللّٰہ اپنے شعر و ادب کے میدان میں فعال ہیں۔

جاؤرہ میں اردو کی ترقّی ترویج کے سلسلے میں پروفیسر وسیم الدین کا ذکر نہ کرنا انتہائی نا سپاسی ہوگی جنھوں نے اسکول سے لیکر یونیورسٹی تک جاؤرہ سے اجّین، امراؤتی مہاراشٹر، علی گڑھ وغیرہ تک رسائی کی اور آج جاؤرہ میں جو ایم۔اے۔تک اردو پڑھائی جا رہی ہے آپ ہی کی مرہون منّت ہے اور وہ نام ہے پروفیسر وسیم الدین صاحب آج جاؤرہ میں جتنے سرکاری یا غیر سرکاری اساتذہ موجود ہیں آپ کے شاگرد ہیں۔جاؤرہ میں ادیب، ماہر، کامل کا مرکز آپ ہی نے جاؤرہ کے اسلامیہ اسکول میں قائم کرایا۔آپ بڑے زود گو شاعر تھے آپ کے گھر پر بہت قابل لوگوں کی مجالیس ہوا کرتی تھیں۔اردو ،عربی، انگریزی زبانوں پر آپ کو پورا عبور حاصل تھا۔اپنے تمام شاگردوں کو گھر پر بھی تمام زبانوں کی تعلیم دیا کرتے تھے۔بے حد مزاحیہ مگر بڑی انٹلیکچوئل گفتگو آپ اپنے ساتھیوں سے اور اپنے شاگردوں سے کرتے تھے۔آپ کی شاعری میں غزلیات، منظومات، قطعات، رباعیات وغیرہ موجود ہیں کلام مسوّدات کی شکل میں ہے۔ جو آج تک شائع نہیں ہوا۔حالانکہ آپ کی نگرانی میں جاؤرہ کے بھگت سنگھ ڈگری کالج میں بہت تحقیقی کام ہوئے، اور بڑے اعلیٰ درجہ کے کام ہوئے۔آپ نوکری سے رٹائرمینٹ کے قریب بیمار رہنے لگے اور اس کے بعد بھی اتنا وقت نہیں ملا کہ اپنے کلام کو شائع کرنے کی سعی کی جاتی اور ایک لمبی بیماری کے بعد آپ اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے، مگر آپ کے کرائے گئے تحقیقی کا آج بھی جاؤرہ اور اجّین کالج کی لائبریری کی زینت بنے ہوئے ہیں جس سے آج بھی طلبا مستفیض ہو رہے ہیں۔

ایک قابلِ ذکر ہستی جو بڑی سنجیدگی کے ساتھ شعر و ادب کی خدمات انجام دیتے رہے وہ تھے، معظّم خان ساحرؔ افغانی سب سے الگ لہجہ نئی قدروں اور زندگی کے مسائل کے ترجمان وقت کے کرب اور زندگی کی الجھنوں کو محسوس کرنے والے شاعر تھے۔نئے تقاضوں کا احساسات آپ کی غزلیات و منظومات میں ملتا ہے۔ملک کے ادبی رسائل میں آپ کی شاعری شائع ہوتی رہتی تھی۔اپنی وفات سے قبل آپ گذشتہ کئی سالوں تک ریڈیو اور ٹی۔وی۔سے آپ کے پروگرام نشر ہوئے۔ملک کے کئی کل ہند مشاعروں میں کئی شہروں میں آپنے شرکت کی جس میں خاص طور پر بمبئی میں دلیپ کمار کی صدارت میں منعقدہ ایک مشاعرہ جس میں ساحرؔ افغانی نے بڑے بڑے شعرا مثلاً ندا فاضلیؔ، جاوید اخترؔ، گلزارؔ، مجروحؔ سلطان پوری وغیرہ جیسے بڑے پایہ کے شعرا کے ساتھ مشاعرہ پڑھا۔آپ کا کلام بھی شائع نہ ہوسکا مگر مسوّدات کی شکل میں کلام اب بھی موجود ہے اور عام لوگوں کو آپ کی غزلیات یاد ہیں جاؤرہ کے کئی گلوکار آپ کا کلام اب بھی ریڈیو اور ٹی۔وی۔پروگرام میں گا رہے ہیں۔علم و ادب کا یہ چراغ ابھی اپنی روشنی دنیا میں بکھیر کر گل ہوگیا۔

جاؤرہ علم و ادب کے فروغ میں علمی و ادبی مراکز کا بھی اہم کردار ہے، مثلاً یہاں کے مشاعرے، چھاپہ خانے، حسین ٹیکری شریف، درگاہ حضرت ابوسعید شہیدؒ، خانقاہِ عالیہ نقشبندیہ ،سرسیّد اردو لائبریری اور کئی لوگوں کی گھریلو لائبریری جن میں اردو ادب کی نایاب کتب مخطوطات کا ذخیرہ موجود ہے مگر وہ اب ایسے لوگوں کے ہاتھ ہے جو اردو ادب ہی کیا اردو زبان سے ہی نابلد ہیں۔جاؤرہ میں پانچ ہائر سیکنڈری اسکول ہیں ان میں اردو اختیاری مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے۔

الحاصل ریاست جاؤرہ جو اپنے عہد عروج میں گلشن آباد کے نام سے معروف رہا ہے۔اردو زبان و ادب کی تاریخ میں اس کی اہمیت و افادیت مسلم ہے۔وسط ہند میں اس ریاست نے اردو زبان کو مروج اور عام کرنے میں جو کارہائے نمایاں خدمات انجام دی ہیں وہ اظہر من الشّمس ہے۔اسی گرانقدر کارفرمائی کی بنا پر اس کی حیثیت ''جزیرہ اردو'' کی سی ہے۔لیکن آزادی کے بعد اس کی ادبی اور لسانی صورت حال ناگفتہ بہ اور بخت خفتہ ہوگئی ہے۔اہل اردو بھی اس زبان کی ثقافت اور وراثت سے نابلد ہوتے جا رہے ہیں۔اردو زبان کا باکمال سرمایہ قصہ پارینہ ہو کر طاق نسیاں ہوتا جا رہا ہے۔ارباب حل وعقد کی بے اعتنائی سے بیش بہا ادبی خزانہ خزف میں مبدل ہونے میں دیر نہیں۔

❑❑❑

علامہ اقبال کی شاعری اور گنگا جمنی تہذیب



آصف پرویز

ریسرچ اسکالر

عالیہ یونیورسٹی

کولکاتا (مغربی بنگال)

asifparvez14gmail.com

ہمارا ملک ہندوستان تکثیری ہم آہنگی کا پاسبان اور کثرت میں وحدت کا علمبردار رہا ہے۔ مختلف مذاہب، تہذیب وتمدن اور رنگ ونسل کے باشندے باوجود انفرادی تفریق کے آپس میں شیر وشکر ہوکر رہتے اور اپنی زندگی گزارتے آئے ہیں۔ بلا کسی امتیاز ایک دوسرے کے رسم ورواج اور تہواروں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں اور ایک دوسرے کے مذہبی تقدس کا احترام بھی کرتے ہیں۔ ہندوستان کی یہی خصوصیت قومی یکجہتی کے شعور کو ایک فکری وفنی میلان کا روپ عطا کرتی ہیں۔ جب بھی تفریق پسندا نہ، فاشسٹ اور علاحدگی پسند رجحانات سر اٹھاتے رہے ہیں، قومی یکجہتی، قومی آہنگی اور قومی ایکتا کی طا قتیں بھی مجتمع ہوتی رہی اور اس تفریق کے خلاف نبرد آزمائی کا فریضہ انجام دیا۔

اردو زبان ابتدا سے ہی گنگا جمنی تہذیب کی علامت رہی ہے۔ اس زبان نے قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اردو شاعری کا سیکولر مزاج روز روشن کی عیاں ہے جس کی پاسداری کرنے والے شعرا میں شاعر مشرق، ترانہ ہندی کے خالق اور بیسویں صدی کے نما ئندہ شاعر علامہ اقبال کی شخصیت کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے ان کی شخصیت اظہر من الشّمس ہے کہ اقبال بڑے پکے محب وطن، مذہبی رواداری کے پرزور حامی نیز متمدن اور مشہور مذہبی ہستیوں کے مدا ح خواں تھے۔ اگر چہ اقبال کے تصور حیات کی بنیاد اسلامی تعلیمات پر مبنی ہے اس کے باجود انہوں نے ہندو دھرم اور مذاہب ہندوستان کا نہ صرف گہرا مطالعہ کیا بلکہ ہماری گنگا جمنی تہذیب کی مکمل عکاسی ان کی شاعری کا موضوعِ خاص رہی ہے۔ ہندوستانی تہذیب وتمدن اور قومی یکجہتی کے عناصر اقبال کی ابتدائی شاعری میں خاص طور پر جلوہ گر ہیں۔ چنانچہ جب ہم بانگ درا کی شاعری بالخصوص نظموں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں بیشتر نظمیں اسی رنگ شاعری سے مملو نظر آتی ہیں جن کی بنیاد تہذیبی وثقافتی زندگی کی جڑوں میں پیوست ہے اور یہی عناصر اقبال کی مجموعی شاعری میں کارفرما نظر آتے ہیں۔ علامہ کی شاعری ہندوستانی تہذیب وتمدن اور قومی ہم آہنگی کی زندہ ودلآویز تصویریں پیش کرتی ہے۔

اس حوالے سے توقیر احمد خان رقمطراز ہیں۔

''اگر زمانی اعتبار سے اقبال کی شاعری پر نظر ڈالیں تو ہمیں خالص ہندوستانی تہذیب اور تمدن کی جو تصویریں نظر آتی ہیں ان میں تلک، زنار، مندر، شوالہ، تیرتھ، پوجا، گنگا، ہردوار، نانک، گوتم بدھ، رام، گائتری منتر، وید، ہندومت، بھگتی وغیرہ سے سابقہ پڑتا ہے۔''

ماتھے پر ٹیکہ ہندوؤں کی خاص پہچان ہے جسے وہ دوران پوجا لگاتے ہیں۔ اقبال کے ایک قطعہ میں ٹیکہ کا عکس دیکھیے۔

بت پرستی کو مرے پیش نظر لاتی ہے
یاد ایام گزشتہ مجھے شرماتی ہے
ہے جو پیشانی پہ اسلام کا ٹیکہ اقبال
کوئی پنڈت مجھے کہتا ہے تو شرم آتی ہے

اقبال کی نظم 'نیا شوالہ' ہندوستانی تہذیب کی بہترین عکاس ہے اس میں ہندوستانی تمدن کی شفاف تصویریں جلوہ گر ہیں۔

اس نظم کے آخری بند کے اشعار میں کلس صبح صبح گانے کی آوازیں اور پوجا کرنے والوں کی سرمستی صاف طور پر عیاں ہیں۔ فرماتے ہیں۔

دنیا کی تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ
دامانِ آسمان سے اس کا کلس ملا دیں
ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے
سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں
شکتی بھی شانتی بھی بھکتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

ہندوستان کی جن معروف اور متمدن مذہبی ہستیوں کا تذکرہ اقبال اپنے کلام میں کرتے ہیں ان میں سوامی رام تیرتھ، گرونانک، گوتم بدھ، رام چندر جی کے اوصاف وکمالات کا بیان خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ ان عظیم شخصیتوں کا ذکر نہ صرف انکے حوالے سے اقبال کے مذہبی فکر اور مذہبی احترام کا ثبوت دیتا ہے بلکہ اس بات کو بھی ظاہر کرتا ہے کہ اقبال بنیاد پرست نہیں اور نہ کسی نظریہ فکر ومکتب کے حامی و پاسدار ہیں۔

ہندوستان کی جن معروف اور متمدن مذہبی ہستیوں کا تذکرہ اقبال اپنے کلام میں کرتے ہیں ان میں سوامی رام تیرتھ، گرو نانک، گوتم بدھ، رام چندر جی کے اوصاف و کمالات کا بیان خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ ان عظیم شخصیتوں کا ذکر نہ صرف انکے حوالے سے اقبال کے مذہبی فکر اور مذہبی احترام کا ثبوت دیتا ہے بلکہ اس بات کو بھی ظاہر کرتا ہے کہ اقبال بنیاد پرست نہیں اور نہ کسی نظریہ فکر ومکتب کے حامی و پاسدار ہیں۔ بلکہ جذبہ ہندوستانی و حب الوطنی اقبال کا شیوہ اور مذہب ہے۔

ان کا یہ بھی ماننا ہے کہ ہندوستان کے تہذیب وتمدن کی بنیاد انسانی قدروں پر قائم ہے۔ جس کو پروان چڑھانے میں متذکرہ بالا ہستیوں نے بے پناہ کوششیں کی ہیں۔ سوامی رام تیرتھ جن سے اقبال نے سنسکرت کا درس لیا تھا ان کے حوالے سے اپنی نظم 'سوامی رام تیرتھ' میں یوں رقمطراز ہیں۔

ہم بغل دریا سے ہے اے قطرۂ بیتاب تو
پہلے گوہر تھا بنا اب گوہر نایاب تو
آہ! کھولا کس ادا سے تو نے راز رنگ و بو
میں ابھی تک ہوں اسیر امتیاز رنگ و بو

بلکہ جذبہ ہندوستانی وحب الوطنی اقبال کا شیوہ اور مذہب ہے۔ ان کا یہ بھی ماننا ہے کہ ہندوستان کے تہذیب وتمدن کی بنیاد انسانی قدروں پر قائم ہے۔ جس کو پروان چڑھانے میں متذکرہ بالا ہستیوں نے بے پناہ کوششیں کی ہیں۔ سوامی رام تیرتھ جن سے اقبال نے سنسکرت کا درس لیا تھا ان کے حوالے سے اپنی نظم 'سوامی رام تیرتھ' میں یوں رقمطراز ہیں۔

ہم بغل دریا سے ہے اے قطرۂ بیتاب تو
پہلے گوہر تھا بنا اب گوہر نایاب تو
آہ! کھولا کس ادا سے تو نے راز رنگ و بو
میں ابھی تک ہوں اسیر امتیاز رنگ و بو

سکھ مذہب کے بانی گرونانک کا ذکر ان کی دو نظموں میں موجود ہے ایک 'ہندوستانی بچوں کا قومی گیت' اور دوسری بانگ درا کی آخری نظم جس کا عنوان ہی 'نانک' ہے

چشتی نے جس زمیں پہ پیغام حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے
(ہندوستانی بچوں کا قومی گیت)

پھر اٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو ایک مرد کامل نے جگایا خواب سے
(نانک)

اور پھر رام جی کو امام ہند کہتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ہے رام کے وجود پہ ہندوستان کو ناز
اہل نظر سمجھتے ہیں اس کو امام ہند

اقبال اپنے برہمن زادہ ہونے پر نازاں تھے کیوں کہ برہمن کو ہندوستانی تہذیب وتمدن میں کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ اقبال کی شاعری

میں برہمن کا تہذیبی عکس جا بجا دکھائی دیتا ہے ۔وہ ہندوستان کے اس بنیادی پیکر سے بے پناہ محبت کرتے ہیں اور اپنی شاعری میں اس کا تذکرہ کثرت سے کرتے ہیں۔

میں اصل کا سو منا تی
آ با مرے لا تی و مناتی
تو سید ہا شمی کی اولاد
میری کف کف برہمن زاد

ہندوستانی تہذیب وتمدن سے متعلق اقبال کا بڑا کارنامہ ترجمہ گائتری ہے جو ہندو مذہب کی ایک اہم اور مشہور دعا ہے اس دعا کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس دعا کو صرف برہمن ہی پڑھ سکتے ہیں پو رے وید میں یہی سب سے مقدس اور خصوصی دعا ہے لہٰذا اقبال نے اس دعا کی خصوصیت اور اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اسے اردو کا جا مہ پہنایا۔ یہ نظم بانگ درا میں 'آفتاب' کے نام سے موجود ہے۔

جب یہ نظم ۱۹۰۲ء میں پہلی بار مخزن میں شائع ہوئی تو اس کے ساتھ اقبال کا ایک تمہیدی نوٹ بھی تھا۔

گائتری منتر کا پس منظر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''....قدیم قوموں اور صوفیائے اسلام نے بھی خدا کے وجود کو نور کہا ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے ''اللہ نور السمٰوات والارض''

'' گائتری'' جو کہ شیرینی اور نغمگی سے بھرپور حرف وصوت کا بے مثل مرقع ہے۔ تقریباً نا قابل ترجمہ ہے۔ ان دشواریوں کے پیش نظر اس کا ترجمہ 'سوریہ نارائن اپنشد' میں مندرج وضا حت پر مبنی ہے میرے اشعار اچھے ہیں تا ہم میری نظم کو 'گائتری' نہیں کہا جاسکتا۔''

اے آفتاب روح و روانِ جہاں ہے تو
شیرا زہ بند لیلِ کون و مکاں ہے تو

اقبال نے مختلف زاویے سے ہندوستانی تہذیب وثقافت کا تصور نمایاں کیا ہے، ترانہ ہندی میں تو انہوں نے جذبۂ حب الوطنی کو بام عروج پر فائز کر دیا ہے اتنے سال گزر جانے کے باجود بھی اقبال کا پیش کردہ نظریہ اور قومی یکجہتی کا تصور اسی طرح تابناک اور روشن ہے اور شاید صدیاں گزر کر بھی ان کے تصور کی عظمت کو زک نہ پہنچا سکیں گی اور جب کبھی فرقہ پرست طاقتیں فرقہ پرستی کا زہر گھولنے کی کوشش کریں گی تو اقبال کا پیغام ہمیں قومی یکجہتی کا درس دیتا رہے گا۔

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

غرض اقبال کی شاعری ہندوستانی تہذیب وتمدن اور قومی یکجہتی کی بہترین عکاس ہے۔ اقبال آخری دم تک ہمیں قومی یکجہتی اور حب الوطنی کا پیغام دیتے رہے ہیں۔ ان کا پیغام یہی ہے کہ ہمیں اپنے ملک پر، اس کے بیش قیمت ورثے پر، اس کی موجودہ ترقی اور شاندار مستقبل پر ہمیشہ ناز ہو۔ وطن دوستی اور احترام آدمیت کا صحت مند جذبہ ہی قومی اتحاد کے عناصر کو مستحکم بنیادیں فراہم کرتا ہے۔

اے آفتاب! ہم کو ضیائے شعور دے
چشم خرد کو اپنی تجلی سے نور دے

اقبال کا فلسفہ گیتا کے فلسفہ سے قریب تر نظر آتا ہے جہاں گیتا کا پیغام ہے کہ عمل کی سزا و جزا کی پرواہ کیے بغیر عمل کو اپنا نصب العین بنایا جا ئے تو اقبال نے کوشش ناتمام اور حرکت وعمل کو زندگی کی کنجی قرار دیا ہے۔ اقبال کے فلسفہ عمل کے کردار کی تشکیل میں گیتا کا اثر کارفرما نظر آتا ہے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

اقبال کو سنسکرت زبان وادب اور ہندوستانی فکر وفلسفہ سے گہری دلچسپی تھی وہ صرف گیتا ہی کے ترجمہ کا قصد نہیں رکھتے تھے بلکہ رامائن کا اردو ترجمہ کرنے کے بھی خواہش مند تھے۔ تاکہ اہل اردو بھی ہندوستانی سنسکرتی اور فلسفہ سمجھ کر اپنے فکر وفلسفہ کو روشن کرسکیں۔ اقبال کی سنسکرت زبان سے دلچسپی بھی ہندوستانی تہذیب وتمدن سے دلچسپی کے باعث تھی۔

ہندوستان اپنی ابتدائے آفرینش سے ہی انسان دوستی اور قومی یکجہتی کا پیامبر رہا ہے۔ ہندوستانی تہذیب وتمدن کی سب سے بڑی خوبی یہ کہ یہاں جب بھی فرقہ پرستی اور احیاء پرستی کی بات کی گئی تب تب ہم ہندوستانیوں نے قومی یکجہتی کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہوئے اسکی پرزور مخالفت کی۔

اقبال نے بھی اپنی نظموں میں ہمیشہ فرقہ پرستی کی مخالفت کی اور نوجوانان ہند کو اس فتنے کے خلاف لڑنے اور اس سے نبرد آزما ہونے کا پیغام دیا ہے۔

بانگ درا کا آغاز ہی نظم ہمالہ سے ہوتا ہے اور اقبال ہندوستانی عظمت کی سب سے بڑی علامت پر نظم لکھ کر نہ صرف ہندوستانی

تہذیب بلکہ پوری مشرقی تہذیب سے دنیا کو روشناس کرواتے ہیں۔ نظم ہمالہ کا آغاز ان لفظوں میں کرتے ہیں۔

اے ہمالہ! اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں!
چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں

ہندوستانی تہذیب اور قومی یکجہتی کی زندہ اور دلآویز تصویریں اس کی نظم 'نیا شوالہ' میں بڑی آن بان کے ساتھ نظر آتی ہیں۔

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے

اور پھر

دنیا کی تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ
دامانِ آسماں سے اس کا کلس ملا دیں

وا نہ کرنا فرقہ بندی کے لیے اپنی زباں
چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامۂ محشر یہاں
(سید کی لوح تربت)

پھر آپسی بھائی چارے کا درس دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

وصل کے اسباب پیدا ہوں تری تحریر سے
دیکھ کوئی دل نہ دکھ جائے تری تقریر سے
(سید کی لوح تربت)

''تصویر درد'' میں اقبال نے قومی یکجہتی کے تصور کو مزید وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے، جس کی وہ پہلے ہی نشاندہی کر چکے تھے۔ قوم کے دیدۂ بینا کی حیثیت سے انہوں نے ہندوستان کی موجودہ حالت پر آنسو بھی بہائے اور پیغام نجات بھی دیا ہے۔

ایسا پیغام جو زماں و مکاں کی قید سے بلند تر ہے اس نظم میں اقبال کی آواز فرقہ پرستی کے خلاف پوری شدت سے ابھرتی ہے وہ اپنے ہم وطنوں کو ذلت و رسوائی سے ابھارنا اور خواب غفلت سے بیدار کرنا چاہتے ہیں۔ یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو!
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

اقبال تعصب، تنگ نظری اور فرقہ پرستی کو قومی یکجہتی کے منافی سمجھتے ہوئے کہتے ہیں۔

تعصب چھوڑ ناداں دہر کے آئینہ خانہ میں
یہ تصویریں ہیں تیری جن کو سمجھا ہے برا تو نے

اقبال نے مختلف زاویے سے ہندوستانی تہذیب و ثقافت کا تصور نمایاں کیا ہے، ترانہ ہندی میں تو انہوں نے جذبۂ حب الوطنی کو بام عروج پر فائز کر دیا ہے اتنے سال گزر جانے کے باجود بھی اقبال کا پیش کردہ نظریہ اور قومی یکجہتی کا تصور اسی طرح تابناک اور روشن ہے اور شاید صدیاں گزر کر بھی ان کے تصور کی عظمت کو زک نہ پہنچا سکیں گی اور جب کبھی فرقہ پرست طاقتیں فرقہ پرستی کا زہر گھولنے کی کوشش کریں گی تو اقبال کا پیغام ہمیں قومی یکجہتی کا درس دیتا رہے گا۔

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

غرض اقبال کی شاعری ہندوستانی تہذیب و تمدن اور قومی یکجہتی کی بہترین عکاس ہے۔

اقبال آخری دم تک ہمیں قومی یکجہتی اور حب الوطنی کا پیغام دیتے رہے ہیں۔ ان کا پیغام یہی ہے کہ ہمیں اپنے ملک پر، اس کے بیش قیمت ورثے پر، اس کی موجودہ ترقی اور شاندار مستقبل پر ہمیشہ ناز ہو۔ وطن دوستی اور احترام آدمیت کا صحت مند جذبہ ہی قومی اتحاد کے عناصر کو مستحکم بنیادیں فراہم کرتا ہے۔

اقبال کی شاعری کا تہذیبی و تمدنی مطالعہ ہمارے اندر مذہبی رواداری اور ہر مذہب اور عقیدے کی بنیادی تعلیمات اور اساسی عقائد کو سمجھنے اور ان کی قدر و قیمت پہچاننے کا بھی درس دیتا ہے۔ کیوں کہ ہمارے ملک میں مختلف فرقے، مذاہب کے ماننے والے اور مختلف زبانیں بولنے والے لوگ بستے ہیں۔

ہمارے سبھی دوسرے مذہبی رہنماؤں اور ان کے عقائد کا احترام کرنا نہایت ضروری اور لازمی ہے۔

عصر حاضر کے تناظر میں یہ ہمارے لیے لمحہ فکریہ ہے کہ ہم اپنے بچوں کو ایک دوسرے کے مذہب اور عقائد سے کما حقہ واقف کرائیں تاکہ ہماری آنے والی نسلوں میں مذہبی منافرت پیدا نہ ہو اور ایک دوسرے کے مذہب کے احترام کا جذبہ بیدار ہو نیز ہماری گنگا جمنی تہذیب جو ہمارے اتحاد کی علامت ہے اس پر کبھی کوئی آنچ نہ آنے پائے اور جب کبھی فرقہ پرست طاقتیں ہمارے درمیان پھوٹ ڈالنے کی کوشش کریں تو باہمی اتحاد و اعتماد و قومی یکجہتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان فرقہ پرست طاقتوں کا منھ توڑ جواب دے سکیں۔

یقیناً ہم کہہ سکتے ہیں کہ اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعہ قومی یکجہتی کے شعور کو بالکل واضح کر کے اور اس تاریخی و تہذیبی تسلسل کی ترجمانی کر کے ایک نئے دور کی شاعری کی بنیاد رکھی ہے۔

❑❑❑

چاہتوں کی بازگشت



ندیم راعی

۱۹۸، چودھری ہاؤس

گل شہید

مرادآباد

رابطہ: 8188937127

میں اس کی بانہوں میں اور وہ میری بانہوں میں تھی، کچھ لمحات کے لئے میری سانسیں تیز ہوگئی تھیں وقت جیسے تھم سا گیا تھا۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے میں بے خودی کے عالم میں پہنچ گیا تھا۔ جسے دور دور سے میں نہارتا اپنی آنکھوں میں بساتا اور آنکھوں کے ذریعہ اپنے دل کا حال کہا کرتا شاید وہ میری آنکھوں کی زبان سمجھ کر اپنی آنکھیں اثبات میں جھکا لیا کرتی میں اس کے نقش ونگار، خدوخال اور خوبصورت چہرے کو دیکھتا ہی رہتا۔ وہ بلا کی ذہین اردو ادب میں ماہر شعرو نثری تصانیف کے مطالعہ کی جنون کی حد تک شوقین.... جب کسی سے ہم کلام ہوتی تو ایسا لگتا کہ کوئی نغمہ سرا ہے۔

اردو کے الفاظ کا استعمال تو کوئی اس سے سیکھے۔ نت نئے نئے لفظوں کو نہایت ہی سلیقے سے اپنی گفتگو میں استعمال کرنا بس اسی کا حصہ ہے۔ میں ٹکٹکی باندھے خموشی سے اسے سماعت کرتا رہتا۔ اللہ تبارک تعالیٰ نے سمندروں کے نایاب موتیوں کو چن چن کر اس کے دانت بنائے ہیں اگر چہ ٹوتھ پیسٹ کمپنی یہ دانت دیکھ لیں تو منہ مانگی قیمت پر دانتوں کی ماڈلنگ پر اسے راضی کرنے پر تل جائیں۔ جھیل سی خوبصورت آنکھیں، آبرو خمدار گول مٹول چہرہ دراز قد اور بالی عمر، سینٹ اراماڈل اسکول کی باصلاحیت ٹیچر کے ساتھ وقت گذارنے کا شرف مجھے حاصل ہوا ہم ریلوے اسٹیشن پر ملے اور بذریعہ ٹرین ہمیں لکھنؤ ایک: سمینار ''اردو کی بقا اور ہماری ذمہ داریاں'' میں جانا تھا۔

بسوں کی ہڑتال کی وجہ سے بڑی زبردست بھیڑ تھی ٹرین میں سوار ہونا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا ہم کسی بھی حال میں اس ٹرین کو مس کرنا نہیں چاہتے تھے۔ لہٰذا زبردستی ہمیں ٹرین کے ڈبے میں گھسنا پڑا جیسے ہی ہم ٹرین میں داخل ہوئے کہ اترنے والوں کا ریلا آیا اور وہ میری باہنوں میں سما گئی ایک منٹ کے بعد جب راستہ صاف ہوا تو شرماتے ہوئے سوری کہہ کر مجھ سے الگ ہوگئی۔ جیسے مجھے قارون کا خزانہ مل گیا ہو؟ ساری کائنات کی خوشیاں میری جھولی میں آکر گر گئی ہوں۔ اس کے جسم کے لمس نے مجھے مسحور کر دیا تھا۔ بارہ بنکی سے لکھنؤ کا تیس منٹ کا سفر ہم نے خموش رہ کر گزارا۔

چار باغ اسٹیشن آتے ہی ہم اپنے اپنے مقالوں پر نظر ثانی کرنے لگے۔لیکن میں تو سب کچھ بھول گیا تھا میرے ذہن و دل پر وہ لمحات جیسے انمٹ چھاپ بن گئے تھے۔اس کی سانسوں کی خوشبو نے مجھے دیوانہ بنا دیا تھا میری نگاہیں تو کاغذ پر تھیں لیکن ذہن گذرے ہوئے لمحات کی بازگشت کر رہا تھا۔

سیمینار میں پاکستان سے تشریف لائے ممتاز ادیب و نقاد انتظار حسین مسند صدارت پر جلوہ افروز تھے۔ اردو اکادمی بہار کے نائب صدر ڈاکٹر غیاث الدین راعی شعبہ اردو پٹنہ یونیورسٹی کے ڈاکٹر عیسیٰ اور معروف فکشن نگار ڈاکٹر عبید اللہ چودھری گورکھپوری اسٹیج کو رونق بخش رہے تھے۔معروف ادیب و شاعر ڈاکٹر ہارون رشید نظامت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔میں کنکھیوں سے اسے بار بار دیکھ رہا تھا جو زنانہ لابی میں بیٹھی تھی۔ گوری چٹی، پتلی دبلی، قدرے دراز قد گویا کہ وہاں بیٹھی عام مستورات میں سب سے زیادہ حسین و خوبرو، جسے اس کے آس پاس بیٹھی لڑکیاں بھی رشک بھری نظروں سے دیکھ رہی تھیں اور میں تو صرف اسے دیکھنے میں محو تھا۔ وہ بھی اکثر و بیشتر میری جانب دیکھ کر....اپنی مدبھری آنکھوں سے یہ پیغام دے جاتی کہ جو تڑپ وہاں سے کم حقہ وہی تڑپ یہاں بھی ہے جو جذبات وہاں ہیں یہاں بھی کارفرماں ہیں۔

ہم نے اپنے اپنے مقالے پڑھے جسے حاضرین خاص طور سے صدر محترم نے پسند کیا میری تمام دلچسپیاں اس کے اردگرد محدود تھیں۔ میں نے اس کا مقالہ بغور سنا اور بار بار داد بھی دی ۔مقالہ پڑھنے کا اس کا انداز قابل ستائش تھا۔

سیمینار میں پاکستان سے تشریف لائے ممتاز ادیب و نقاد انتظار حسین مسند صدارت پر جلوہ افروز تھے۔ اردو اکادمی بہار کے نائب صدر ڈاکٹر غیاث الدین راعی شعبہ اردو پٹنہ یونیورسٹی کے ڈاکٹر عیسیٰ اور معروف فکشن نگار ڈاکٹر عبید اللہ چودھری گورکھپوری اسٹیج کو رونق بخش رہے تھے۔معروف ادیب و شاعر ڈاکٹر ہارون رشید نظامت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔میں کنکھیوں سے اسے بار بار دیکھ رہا تھا جو زنانہ لابی میں بیٹھی تھی۔ گوری چٹی، پتلی دبلی، قدرے دراز قد گویا کہ وہاں بیٹھی عام مستورات میں سب سے زیادہ حسین و خوبرو، جسے اس کے آس پاس بیٹھی لڑکیاں بھی رشک بھری نظروں سے دیکھ رہی تھیں اور میں تو صرف اسے دیکھنے میں محو تھا۔ وہ بھی اکثر و بیشتر میری جانب دیکھ کر....اپنی مدبھری آنکھوں سے یہ پیغام دے جاتی کہ جو تڑپ وہاں سے کم حقہ وہی تڑپ یہاں بھی ہے جو جذبات وہاں ہیں یہاں بھی کارفرماں ہیں۔

ہم نے اپنے اپنے مقالے پڑھے جسے حاضرین خاص طور سے صدر محترم نے پسند کیا میری تمام دلچسپیاں اس کے اردگرد محدود تھیں۔

پروگرام کب ختم ہو پھر سے اس کا ساتھ ملے اس کا لمس اس کی گفتگو سے پھر میں محظوظ ہو جاؤں پھر سے وہ اپنی مخمور نگاہوں سے مجھے دیکھے اور میں پھر سے اپنی آنکھوں کے رستے اپنے دل کے نہاں خانوں میں اسے بسالوں۔

میں ایک اردو میڈیم اسکول کا بانی و ٹیچر ہوں اور اردو سے میری دلچسپی جنون کی حد تک ہے۔میرے اسکول کی پرنسپل محترمہ زیدی صبا کی دوستی ہے۔گذشتہ سال پہلی بار میں نے صبا کو محترمہ زیدی کی میرج انورسری کی پارٹی میں دیکھا تھا اور بس دیکھتا ہی رہ گیا تھا اس کا تیر نظر میرے سینے میں آج تک پیوست ہے۔

میرے اور محترمہ زیدی کے بے حد اسرار پر بزم ارباب سخن کے زیر اہتمام ماہانہ شعری نشست میں صبا کی شرکت کو یقینی بنانے کے لئے ہم نے شعری نشست کا وقت ہی بدل دیا تھا۔شام ۵ بجے آغاز اور ۸ بجے اختتام۔

صبا کو آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ سے ایک تقریری مضمون پڑھنے کا کانٹریکٹ ملا تھا۔جس کی تیاری کے لئے اس نے مجھ سے کچھ کتابیں طلب کیں جسے فراہم کر کے میں نے اس تک پہونچائیں بعدہٗ محترمہ زیدی و صبا کے ساتھ جب لکھنؤ پہنچے تو صبا کچھ کچھ بدلی بدلی سی نظر آئی پہلے تو وہ محترمہ زیدی سے چپکی رہتی اور سوال کرنے پر ہی اس کا جواب دیدیتی اپنی جانب سے نہ تو اس نے کوئی سوال کیا اور نہ اپنی جانب سے بات کرنے کی پہل کی لیکن آج محترمہ زیدی کو نظر انداز کر کے اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ مجھ سے ہم کلام تھی۔لمحہ بھر کے لئے وہ مجھ سے جدا ہونے کے موڈ میں نہیں تھی وہ مجھے اپنی آنکھوں میں بسا رہی تھی مجھے سن رہی تھی مجھے محسوس کر رہی تھی اس نے کہا کہ میری وہ غزل بہت خوب تھی پڑھنے کا انداز اچھا تھا لکھنؤ کے سمینار میں میرا مقالہ اسے بہت پسند آیا تھا۔جس کی اس نے کھل کر و منفرد انداز میں تعریف کی۔ اسے میرا شیروانی پہننا بہت اچھا لگتا ہے۔ میرے ہیئر اسٹائل کی پسندیدگی کا بھی اس نے اظہار کیا۔میں متعجب تھا کہ یہ انقلاب کیسے آیا یہ کیا ہو گیا اللہ تعالیٰ نے میرے دل کی فریاد سن لی شاید اسے بھی مجھ سے پیار ہو گیا ہے۔صبا کی

اچانک اس تبدیلی اور بے تکلفی نے میری جان ہی لے لی تھی اور میں بنا پنکھ ہوا کے دوش پر اڑنے لگا تھا۔ گویا دونوں جہاں کی دولت مجھے میسر آ گئی ہو بس اظہار محبت کرنا تھا لیکن یہ سوچ کر میں خموش رہا:

جسے میں تیرے پیار کا انداز سمجھ بیٹھا ہوں
وہ تبسم وہ تکلم کہیں تیری عادت تو نہیں

ریڈیو پروگرام کے بعد ہم لکھنؤ سے واپس آ رہے تھے وہ میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئی تھی اس کی قربت مجھے پاگل کئے دے رہی تھی۔ وہ راستے بھر کیا کیا کہتی رہی مجھے پتہ نہیں اور میں ہاں ہوں میں جواب دیتا رہا۔ ایک انجان دنیا کا سفر طے کر کے ہم اپنی منزل تک پہنچ کر ایک دوسرے سے جدا ہوئے تھے ایک ہفتہ بعد محترمہ زیدی کی رہائش پر ریڈیو سے اس کی تقریر سنی جس کا ایک اک لفظ کانوں میں رس گھول رہا تھا۔ تقریر کے اختتام پر ہم نے اسے مبارکباد پیش کی اور میں ان دونوں کو چھوڑ کر اپنے گھر واپس آ گیا۔ اب لوہا گرم تھا اور وقت آ گیا تھا کہ اظہار محبت کروں کیونکہ دونوں طرف تھی آگ برابر لگی ہوئی۔ سب سے پہلے میں نے محترمہ زیدی کو حال دل سنایا ان کی خموشی میرے لئے ایک چھبتا ہوا نشتر تھی۔ میں نے پھر ان سے کہا کہ میں صبا سے پیار کرتا ہوں اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں اپنی شریک حیات بنانا چاہتا ہوں۔ ماحول میں ایک دم خموشی تھی۔ میں نے پھر دوہراتے ہوئے کہا کہ آپ کے اس سلسلے میں کیا تاثرات ہیں۔ آپ تو اس کے دل کی بات جانتی ہیں اس نے میرے بارے میں آپ سے کچھ تو کہا ہوگا آپ خموش کیوں ہیں۔ آپ نے بھی ہم دونوں کی محبت کو محسوس کیا ہوگا وہ لکھنؤ کا گذشتہ سفر وہ اپنی تمام تر رعنائیاں مجھ پر بکھیرتی ہوئی اپنی چاہتوں کو مجھ پر نچھاور کرنا... آپ کی موجودگی کے باوجود وہ مجھ سے صرف مجھ سے محو گفتگو ہونا۔ وہ اشاروں و کنایوں میں اس کا اظہار محبت کرنا۔ میں ایک سانس میں

ریڈیو پروگرام کے بعد ہم لکھنؤ سے واپس آ رہے تھے وہ میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئی تھی اس کی قربت مجھے پاگل کئے دے رہی تھی۔ وہ راستے بھر کیا کیا کہتی رہی مجھے پتہ نہیں اور میں ہاں ہوں میں جواب دیتا رہا۔ ایک انجان دنیا کا سفر طے کر کے ہم اپنی منزل تک پہنچ کر ایک دوسرے سے جدا ہوئے تھے ایک ہفتہ بعد محترمہ زیدی کی رہائش پر ریڈیو سے اس کی تقریر سنی جس کا ایک اک لفظ کانوں میں رس گھول رہا تھا۔ تقریر کے اختتام پر ہم نے اسے مبارکباد پیش کی اور میں ان دونوں کو چھوڑ کر اپنے گھر واپس آ گیا۔ اب لوہا گرم تھا اور وقت آ گیا تھا کہ اظہار محبت کروں کیونکہ دونوں طرف تھی آگ برابر لگی ہوئی۔ سب سے پہلے میں نے محترمہ زیدی کو حال دل سنایا ان کی خموشی میرے لئے ایک چھبتا ہوا نشتر تھی۔ میں نے پھر ان سے کہا کہ میں صبا سے پیار کرتا ہوں اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں اپنی شریک حیات بنانا چاہتا ہوں۔ ماحول میں ایک دم خموشی تھی۔ میں نے پھر دوہراتے ہوئے کہا کہ آپ کے اس سلسلے میں کیا تاثرات ہیں۔

یہ سب کچھ کہہ گیا تھا۔

''صبا نے پہلے ہی مجھ سے اپنی محبت کا اظہار کر دیا تھا۔ وہ بھی تم سے محبت کرتی ہے۔'' محترمہ زیدی کے الفاظ جیسے ہی میری سماعت پر گذرے میری جان میں جان آ گئی جیسے مجھے ایک نئی زندگی مل گئی ہو جیسے خزاں میں بہار کا موسم ترنگیں مارنے لگا ہو جیسے بیاباں میں پھول کھل گئے ہوں۔ محترمہ زیدی نے مزید کہا کہ ''صبا کا تعلق راعین برادری سے ہے اور ان کے بزرگ خود کو عربی النسل مانتے ہوئے صرف اور صرف اپنے قبیلہ یعنی اپنی برادری میں ہی شادیاں کرتے ہیں۔ لیکن تم تو پٹھان برادری سے ہو اور کسی غیر برادری سے اپنی بیٹی کی شادی ہرگز نہیں کریں گے۔ اور آپ کے گھر والے بھی کسی راعین کی بیٹی کو اپنی بہو بنانا پسند نہیں کریں گے۔''

یہ سن کر میں خوشی سے اچھل پڑا میں نے محترمہ کو بتایا کہ میرا تعلق راعین خانوادہ سے ہے۔ خان تو اپنے نام کے ساتھ محض اس لئے جوڑتے ہیں کہ ہمارے پردادا کو انگریزوں نے خان بہادر کے خطاب سے سرفراز کیا تھا۔ تبھی سے نسل در نسل ہم اپنے نام کے ساتھ خان لگا رہے ہیں لیکن ہمارے یہاں آج بھی شادیاں راعین میں ہی ہوتی ہیں۔ میرے دادا جے پور سے یہاں آ کر بس گئے تھے۔ اور یہاں کے زیادہ تر لوگ تو ہمیں راعین ہی جانتے ہیں۔

خان بہادر محمد محسن کے پڑپوتے محمد اسلم خان کی بارات بڑے اہتمام کے ساتھ صفدر حسین راعین کے گھر پہنچی۔ صبا دلہن بنی قیامت ڈھا رہی تھی۔ تقریباً بیس شہروں سے مہمانان شرکت کے لئے تشریف لائے تھے۔ اور شہر کے شرفاء، سیاستداں و ادبی اداروں کے نمائندہ حضرات پیش پیش تھے۔

❑❑❑

عقلمند لکڑہارا

ایک گاؤں کر قریب خوبصورت جنگل جہاں بیچوں بیچ ندی جو دوسرے گاؤں کے اور نکلتی ہے۔لکڑہارا جو ایک بارہ تیرا سال کا قریب کے گاؤں سے آ کر لکڑیا توڑ کر بازار میں بیچ آتا تھا اس کے گھر کا گزر بسر ہوا کرتا تھا اپنی اپائج ماں کی قدمت کے ساتھ ہمیشہ اسے خوش رکھا کرتا تھا، ایک دن کچھ یوں ہوا کے گرمی کے دن تھے لکڑہارا لکڑا جمع کرنے کے بعد ندی کے قریب جا کر دونوں پاؤں کو پانی میں ڈالا بیٹھ گیا، اپنے کمر بندی رسی کھول دی اس لکڑہارے کو جنگل میں کہیں سے ایک بانسری ملی تھی شاید غلطی سے گر گئی تھی جو لکڑیا چونے کے دوران اسے نظر آئی تھی اس کے بعد سے وہ روز آنا اسے بجانے لگتا اسی وجہہ سے وہ بانسری بہت اچھے سے بجانا سیکھ چکا تھا۔

اس دن جب وہ ندی کنارے بیٹے بانسری بجا رہا تھا ادھر سے ایک شخص آتا نظر آیا وہ اسے دیکھ کر روک گیا لیکن اس شخص نے آگے اور بجانے کو کہا وہ مزید بجاتا جا رہا تھا لیکن اس شخص کے جل میں لالچ پیدا ہوئی، اس لئے وہ اسے بھلا پھسلا کر اپنے گھر کی طرف لے جانے لگا آخر کار اسے زور زبردستی کے ذریعہ اپنے گھر لے جا کر ایک کمرے میں بند کر دیا، وہ بہت رونے گا اسے اپنی ماں کی فکر کھائے جا رہی تھی شام سے پہلے پہلے اسے اپنی ماں کے پاس جانا تھا وہ بے صبری سے اس کی راہ تکنے لگے گئی، اس کے بعد وہ شخص اس کے ساتھ کیا کرے گا اسے پتا نہیں تھا، رو رو کر نڈال زمین پر بیٹھ گیا، باہر سے اسے بچوں کی کھلتے ہوئے آواز آئی لکڑہارا جلدی سے اُٹھا اور بانسری بجانا شروع کیا سبھی بچے ایدھر ادھر دیکھنے لگے، لکڑہارا کھڑکی طرف سے باہر جانکنے ہوئے آواز دینے لگا سبھی بچے اس کھڑکی کے طرف آ گئے لکڑہارے نے عقلمندی سے کام لیتے ہوئے کہنے لگا کیا تم سب کو ابھی بانسری سننا ہے۔سب نے ایک ساتھ ہامی بھر دی۔!! لکڑہارے نے کہا پہلے یہ دروازہ تو کھولو تا کے میں تمہارے پاس آ کر بانسری بجاؤں جلدی سے سبھی بچے دروازے کے طرف دوڑے بچے تو آخر بچے ہیں۔پھر کیا تھا لکڑہارا عقلمندی کے ساتھ کمرے سے باہر نکلا لیکن اسے یہاں سے بھاگنے کی ترکیب نظر نہیں آ رہی تھی لیکن بانسری بجانے کے بعد سبھی بچوں کو وہ پاس والے ندی کے بارے میں بتایا اور سبھی بچو کو چلنے کے بارے کہا تو تمام بچے خوشی خوشی راضی ہو گئے بس موقعہ پاتے ہی لکڑہارا بچوں کو لئے ندی کی طرف نکلا ایک ایک کر کے سبھی بچوں کے ساتھ پانی میں کھلا بعد میں کھنے لگا۔

لکڑہارے نے کہا: دیکھو بچو میں کب سے بانسری بجا رہوں۔اور آپ تمہارے ساتھ کھیل کر میں تھک گیا ہوں آ بھی تم سب کھیلو میں پاس ہی کے جھاڑی کے پاس تھوڑی دیر آرام کرتا ہوں پھر دوبارا آ کر تن سب کے ساتھ کھیلوں گا، سبھی نے ہامی بھر دی، اس کے بعد وہ اتنی تیزی کے ساتھ ندی کے پاس سے رپوچکر ہو گیا کے دُبارا ندی کے آس پاس نظر تک نہیں آیا سبھی بچے کھیلنے کے بعد بھوک اور تکھان سے نیڈھال لکڑہارے کا انتظار کرنے کے بعد اپنے گھر کی طرف چل دے، لکڑہارا چالاکی و عقلمندی سے اس قید سے آزاد ہو کر اپنی ماں کے پاس شام ہونے سے پہلے پہلے اپنے گھر آخر پہنچ ہی گیا۔۔!! ❑❑❑



عطیہ نفیس

8-1-523/303
فلیٹ نمبر 105، حسین ریزیڈنسی
ڈیلکس کالونی، ٹولی چوک، حیدرآباد
رابطہ: 9703145343

کتابیں یوں تو سال کے اہم مواقع اور مہینے کے پُرمعنی ایام میں شائع ہوتی ہی رہتی ہیں اور ر ہر کسی کو اپنے وجود کا احساس کراجاتی ہیں ۔اان کے چرچے ہر جا ہوتے ہیں اور ان پر بحثیں شروع ہوجاتی ہیں ۔ان میں سے متعدد ایسی ہوتی ہیں جو ذہن و دماغ کو چھو جاتی ہیں اور فکروں کو مہمیز کرجاتی ہیں ۔وہ بے اختیار قاری کو پسند آتی ہیں اور اپنے اوپر کچھ لکھوانے کو مجبور کردیتی ہیں ۔(یہ مجبوری بہ معنی جبر وظلم نہیں، بلکہ بہ معنی مہمیز وتحریک ہے)ممکن ہے کچھ وقت تک یہ کیف مجبوری لگتا ہومگر کچھ دور چلنے کے بعد وہ شوق وجذبے میں تبدیل ہوجاتا ہے ۔شوق وجذبہ بھی ایسا کہ قلم کی نوک خود بہ خود سینۂ قرطاس پر چلنے لگتی ہے، یا ڈیجیٹل کمپیوٹر و لیپ ٹاپ پر انگلیاں اپنے آپ تھرکنے لگتی ہیں ۔اسی طرح ان کی ہم نوائی کی خاطر لفظ خود نطق بن جاتے ہیں اور مترنم انداز میں کلام کرنے لگتے ہیں ۔

ایسی ہی ایک کتاب کی باتیں ہیں، جس کا نام ہے ''باتیں سخن کی'' جو ڈاکٹر عمیر منظر کے قلم جوہر بار کا ثمر ہے ۔یہ کتاب مختلف مضامین کا مجموعہ ہے ۔یہ مضامین محض مضامین نہیں انھیں اردو ادب کا گراں قدر سرمایہ کہیے ۔! یہ تمام مضامین وہ ہیں جو ملک کے مؤقر رسائل و جرائد کی اشاعتوں کی زینت بنے ہیں ۔ان مضامین کی خاص بات یہ ہے کہ یہ تمام کے تمام اردو ادب کی صنف شاعری سے متعلق ہیں ۔جیسا کہ خود صاحب مضامین نے اعتراف کیا ہے:

'مختلف اوقات میں لکھے گئے ان مضامین میں باہمی اشتراک کا ایک پہلو یہ ہے کہ ان سب کا تعلق شاعری سے ہے ۔اس میں مثنوی، نظم اور غزل تین اصناف شامل ہیں ۔

مثنوی ،نظم اور غزل... حقیقت بھی یہ ہے کہ آج بھی اردو شاعری کی پہچان ان ہی تین اصناف سخن کی بدولت ہے ۔جدید تجربے، سہولت مآب طریقے اور تسہیل بہ انداز غیر موزوں اختصار، اب شاعری کا حصہ نہیں ہے ۔ہاں غزل ہر عہد میں مقبول ہے، نظم ہر رجحان کی پڑھی جاتی ہے اور مثنویاں تو اب خال خال ہی نظر آتی ہیں ۔'

نام کتاب کیا

باتیں سخن کی

مصنف

ڈاکٹر عمیر منظر

ملنے کے پتہ

جملہ کتب فروش

تبصرہ نگار

عمران عاکف خان

ریسرچ اسکالر

جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

کتاب مذکور میں فاضل مضمون نگار نے چند ایسے گمنام شعرا کی زندگی سے بھی پردے اٹھائے ہیں جنھیں گردش ایام گمنامی کے گہرے گہرے اندھیروں میں لے گئی ۔مثلاً شاگرد داغ ،حضرت باغ سنبھلی ۔ان کا تذکرہ بھی ''دبستان داغ کا ایک گمنام شاعر باغ سنبھلی'' کے عنوان سے موجود ہے ۔سطر بہ سطر موصوف، حضرت باغ سنبھلی کی زندگی کو اس طرح نمایاں کرتے گئے ہیں جس طرح گرد میں اٹی کسی قیمتی کتاب سے گرد جھاڑ کر اس کے نقوش اور خدو خال نمایاں کیے جاتے ہیں ۔بیانیہ نہایت دلچسپ اور غیر منجلک ہے ۔باغ سنبھلی کی شاگردی سے متعلق اگر مشاہیر شعرو ادب کے اعتراضات ہیں تو ان کا بھی احاطہ کیا گیا ہے اور اگر ثبوت ہیں تو ان کو بھی حاضر کیا گیا ہے ۔اس طرح سے یہ مضمون معرکۃ الآرا مضمون بن گیا ۔باغ سنبھلی کے منتخب اشعار بھی انھوں نے پیش کیے ہیں جن میں شاگردان داغ کا اثر و رنگ جھلکتا ہے ۔یعنی اس طرح سے باغ سنبھلی فصیح الملک داغ دہلوی کے شاگردوں کی صف میں شامل ہو ہی جاتے ہیں ۔

اسی قبیل کے گمنام شاعروں میں دبستان لکھنؤ کے شاعر ''صدف لکھنوی'' کا تذکرہ بھی لکھنوی لنگو کے انداز میں' خاصے' کی چیز ہے ۔فاضل مضمون نگار کی اس عنوان سازی ''دبستان لکھنؤ کا بھولا بسرا شاعر صدف لکھنوی'' کو پڑھتے ہی انداز ہوتا ہے کہ مہندر ناتھ کول صدف لکھنوی، یقینا رومانی ،خود آگاہ، خدا شناس، فکر منداور درد مند شاعر ہوں گے، کیوں کہ بھولا یا بسرا یا ایسے ہی شعرا کو جاتا ہے نیز ایسے ہی گنج ہائے گرانمایہ ہمارے اردو ادب مزاروں میں دفن ہیں ۔اس خیال کو اس وقت مزید تقویت ملتی چلی جاتی ہے جب سطراً سطراً ان کا تذکرہ پڑھا جاتا ہے ۔ایک جگہ ڈاکٹر عمیر منظر لکھتے ہیں:

غزلیات صدف کے مطالعے سے قاری جن کیفیات سے دوچار ہوتا ہے، ان میں عشق و محبت کی لگن اور درد مندی کا جذبہ نمایاں رہتا ہے ۔محبت کا یہ جذبہ انسانیت کو ان جذبوں سے

ہم کنار کرتا ہے جس کا غالب پہلو خود آگہی اور خدا شناسی ہے۔

فہرست مضامین کتاب میں ایک عنوان ''الفاظ کا مصور: زیب غوری'' بھی ہے۔زیب غوری کے متعلق جتنا بھی کہا/لکھا جائے، اتنا ہی کم ہے۔جس قدر وہ مختصر شعر کہتے تھے، اسی قدر تفصیل طلب ان سے متعلق تشریحی باتیں ہوتی ہیں۔ مجھے ذاتی طور پر جن چند جدید غزل گو شعرا نے متاثر کیا ہے، ان میں امامان جدید غزل گوئی ،حضرت عبدالرحیم قابل اجمیری ، احمد فراز اور امجد اسلام امجد کے بعد زیب غوری ہی کا نام آتا ہے۔

فاضل مضمون نگار نے مضمون کو اچھا خاصہ پلیٹ فارم بھی بنا دیا ہے جہاں پر زیب غوری کے ناقدین اور حامدین آمنے سامنے آکر ان کی شاعری، ان کے فکری وشعری رجحان، کیا وہ جدید یے تھے یا جدیدیت سے کسی قدر کنارہ کش؟ ظ۔ انصاری ان کے متعلق کیا کہتے ہیں اور دوسرے اس اعتراض پر کیا دلیل پیش کر کے اپنا موقف صاف رکھتے ہیں۔ جیسے مباحثے کرتے ہیں ۔لطف کی بات یہ ہے کہ دل چسپی آخر تک باقی رہتی ہے اور نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ زیب غوری کا ایک بڑا شاعر ہونا، الفاظ مصور اور بے جان فکروں کو جان دار بنانا، اسی طرح پھیکے نقشوں کو کلر فل بنا دینا اتنا اہم ہے، جتنا ان کا جدید یا ہونا یا جدیدیت سے بے زار ہونا اہم نہیں ہے۔

''احمد مشتاق کی غزل گوئی'' ان معانی میں اچھا مضمون ہے کہ اب تک احمد مشتاق کی باضابطہ شاعری، فکر وفن، شخصیت اور وجدان و علمیت سے متعلق کوئی مضمون نظروں سے نہیں گزرا۔تاہم یہ وجہ بھی اتنی اہم نہیں جتنی یہ وجہ ہے کہ احمد مشتاق، شمس الرحمان فاروقی کے پسندیدہ شاعر اور ان کے ناول کے عنوان ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' کے شعر ساز ہیں:

کئی چاند تھے سرآسماں کہ چمک چمک کے پلٹ گئے
نہ لہو مرے جگر میں تھا، نہ تمھاری زلف ہ سیاہ تھی

اس کے علاوہ بھی احمد مشتاق کی غزل گوئی کی دوسری خوبیاں ہیں جن کا ذکر مضمون میں نہایت تفصیل سے کیا گیا ہے۔علاوہ ازیں ان کا جامع و بسیط محاکمہ بھی مالہٗ وماعلیہ کے ساتھ کیا گیا ہے۔نمونے کے اشعار بھی پیش کیے گئے ہیں اور فارسی شاعری سے ان کے ڈانڈے بھی ملائے گئے ہیں۔اس طرح کہہ سکتے ہیں یہ مضمون بھی حوالہ جاتی اور معلوماتی مضمون بننے کی اپنی تمام ذمہ داریاں پوری کرتا ہے۔ایک اچھا اور محنت وکوشش کا اظہاریہ ہے مضمون 'احمد مشتاق کی غزل گوئی'

آخری مضمون ''اردو کی غزلیہ شاعری پر فارسی غزل کے اثرات'' ایک کلیدی اور علمی مضمون ہے۔دوسرے لفظوں میں اسے حاصل کتاب مضمون بھی کہا جاسکتا ہے۔یہ کسی شاعر یا صنف کا ترجمہ نہیں بلکہ اردو اور فارسی زبانوں کے رشتوں وفکروں کی یکسانیت کی تلاش، اشعار اور افکار کی ہم آہنگی کی جستجو وکوشش اور ان دونوں زبانوں کے درمیان موجود فاصلوں کو مختلف شعری مضامین کے تقابل کے ذریعے جوڑنے کی محنت ہے ،جیسے مثنوی (مع متعلقات) دنیا کی بے ثباتی اور خدا کی قدرت، کائنات اور اس کی عظمتوں کا بیان، رومانیت و جذباتیت، ترکیبی و تعبیری الفاظ غرض ... اس مضمون میں ہر لحاظ سے دونوں زبانوں کو قریب تر لانے اور انھیں مانوس بنانے کی مہم جوئی کی گئی ہے۔ ڈاکٹر عمیر منظر نے 'شعرالعجم'، 'مقدمۂ شعروشاعری'، 'دلّی کا دبستان شاعری' اور 'شعر شور انگیز' جیسی کتابوں کے علاوہ اساتذۂ شعروسخن، علما ومشاہیر ادب کے حوالوں سے بھی مضمون بالا کو سجایا ہے اور جا بہ جا اردو اور فارسی کے درمیان قربتوں اور نزدیکیوں کو نمایاں کیا ہے۔تاہم وہ اپنی زبان کی حمایت میں ایک دو باتیں پھر بھی کہہ گئے، جو معنی خیز بھی ہیں، بھلی بھی ہیں، لائق فخر بھی۔وہ ایک جگہ اس طرح لکھتے ہیں:

اخذ و استفادہ کی یہ صورت حال مختلف اور متنوع ہے۔یہ کہنا کہ فارسی شعرا کی غزلوں سے ہی اردو شاعری کا ایوان سجایا گیا ،غلط ہے۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ فارسی غزلوں کو اردو قالب میں ڈھالنے کا عمل ترجمے کا عمل ہوتے ہوئے بھی تخلیق کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ان اردو اشعار پر ترجمے سے کہیں زیادہ تخلیق کا گمان ہوتا ہے۔

یہ باتیں بالکل سچی ہیں جنھیں پنجابی زبان کے ''سچے گلّاں'' سے تعبیر کیا جاسکتا ہے ۔ان سے انکار واختلاف اُن معنوں میں تو نہیں ہوسکتا جو روایتی ہیں، تاہم اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ اردو زبان اور فارسی وعربی یا ان کی شاخیں، اُن تمام میں بہت سی قدریں مشترک ہیں ۔قدروں کا یہ اشتراک اس بات کا مزید متقاضی ہے کہ انھیں زیادہ سے زیادہ موضوع بحث بنایا جائے۔جس کا سلسلہ مضمون مذکور سے شروع تو ہوگیا ہے، اب اس ضمن میں کتنے اور مضامین لکھے جائیں گے؟ اس کا جواب ابھی مستقبل کے پردوں میں محفوظ ہے

❑❑❑



ڈاکٹر عبداللہ چودھری کی نگارشات

ڈاکٹر عبداللہ چودھری معروف افسانہ نگار اور فکشن کے نقاد بھی ہیں۔ فکشن پر آپ کا مطالعہ بڑا عمیق ہے، سماج کے مختلف پہلوؤں پر انہوں نے افسانوں میں روشنی ڈالی ہے، ان کے افسانوں میں نفسیاتی مسائل بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر چودھری کے افسانے کی خاص بات یہ ہے کہ وہ معمولی سے معمولی بات کو بھی افسانوی جامع پہنانے کا فن خوب جانتے ہیں۔ جو ایک کامیاب افسانہ نگار کی دلیل ہے۔ افسانوں کے علاوہ وہ ایک بہترین اور مجھے ہوئے مضمون نگار بھی ہیں۔ ڈاکٹر عبداللہ چودھری کی نگارشات ان کے مختلف مضامین کا مجموعہ ہے۔ جس میں کل 15 تنقیدی مضامین اور 5 افسانے شامل ہیں۔ جسے ڈاکٹر محمد اصغر انصاری نے مرتب کر عرشیہ پبلیکیشن دہلی سے شائع کرایا۔ ڈاکٹر انصاری یوپی کے ضلع بلیا سے تعلق رکھتے ہیں ان کا موبائل نمبر 7076554040 ہے۔ ڈاکٹر محمد اصغر نے وشو بھارتی یونیورسٹی شانتی نیکیتن سے "اردو تنقید نگاری میں ڈاکٹر سلام سندیلوی کا حصہ: ایک تجزیاتی مطالعہ" پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔



اونچی اڑان

افسانچہ نگاری میں ڈاکٹر ایم اے حق ایک مستند نام ہے جو گزشتہ 50 برسوں سے افسانچہ نگاری پر ہی کام کر رہے ہیں۔ ان کے افسانچہ کی یہ خوبی ہے کہ وہ بڑی سے بڑی بات کو یا یوں کہا جائے کہ پوری داستان کو مختصر جملوں میں پیش کرنے کا ہنر بخوب ہی آتا ہے۔ بچوں کے لئے افسانچہ اطفال لکھنا ایک بے حد مشکل فن ہے جسے ڈاکٹر حق نے بڑے سائنٹفک طریقہ سے تحریر کیا ہے۔ ادھر انہوں نے بچوں کی ذہن سازی اور اخلاقی تربیت کے مدنظر جو افسانچہ اطفال لکھیں ہیں اسے "اونچی اڑان کے نام سے سوریا پبلیکیشن جھارکھنڈ سے شائع کرایا ہے۔ جس میں کل 62 افسانچہ اور 120 مشاہر ادب کے آرا شامل ہیں۔ بچوں کی ذہنی نشوونما کے لئے ایسے افسانچوں کو نصاب میں شامل ہونا چاہئے نصیحت، کھیل کھیل میں، ہابیل اور قابیل، نانی کی کہانی، استاد اور شاگرد انوکھا فیصلہ وغیرہ افسانچے کتاب کی جان ہیں۔ ڈاکٹر ایم اے حق کا تعلق جھارکھنڈ کے رانچی ضلع سے ہے۔ اور ان کا موبائل نمبر 7903131652 ہے۔



پس پردہ

قصہ گوئی، داستان گوئی اور ناول نگاری کے بعد اب افسانہ نگاری نے ۶ صنف افسانہ نگاری کو اپنے فن سے مالا مال کیا ادھر بڑی تیزی سے نئے افسانہ نگاروں نے اپنے نئے افکار و خیال کے ساتھ جو افسانے تحریر کئے اس میں سے بہت سے افسانے بے حد مقبول ہوئے۔ انھیں افسانہ نگاروں میں ایک نام ڈاکٹر عارف انصاری کا بھی ہے۔ ڈاکٹر عارف کی افسانے کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ سماج کی زبوں حالی، رواداری، معاشرے کی اصلاح اور فرسودہ روایات کو اپنے افسانے کو موضوع بناتے ہیں مگر انسانیت کی دکھتی نبض کو موضوع بنا کر اسے جس خوبصورتی کے ساتھ افسانے کی میں ڈھالنے کا جو ہنر ڈاکٹر عارف میں ہے وہ کم افسانہ نگاروں کو نصیب ہوتا ہے۔ وہ مناسب اور موزوں علائم کا استعمال کر کے فن پارے کو تہ دار بنانے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ بہترین غزل گو اور محقق بھی ہی "پس پردہ" ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ جس میں پچھتاوا، پاگل، رمضان سیٹھ، لاکھ ڈاؤن اور شب خون، ۱۲۲ افسانے شامل ہیں۔ ڈاکٹر عارف کا تعلق مدھیہ پردیش کے برہان پور سے ہے جن کا موبائل نمبر ۹۹۹۳۹۹۴۱۴۱ ہے۔



نمود سبز

موجودہ عہد میں نثر کے مقابلے شاعروں کی اچھی خاصی تعداد طبع آزمائی کر رہی ہے اس میں متاشاعر بھی شامل ہیں مگر سنجیدہ اور عروضیات پر دسترس رکھنے والے شعرا کی تعداد بے حد کم ہے جو شاعری کے تمام اصناف پر شعر کہنے کا ہنر رکھتے ہیں ایسے ہی فتح پور کے ایک کہنہ مشق شاعر ہیں ظفر اقبال ظفر۔ ظفر فتح پوری ۲۰۱۹ میں ان کے غزلوں کا پہلا مجموعہ "نمود سبز" کے نام سے منظر عام پر آیا ہے جسے عرشیہ پبلی کیشن دہلی نے شائع کیا ہے۔ طویل عرصے تک ان کی غزلیں ہندوستان اور بیرونی ممالک کے موقر رسائل و اخبارات میں شائع ہوتی رہی اور آج بھی ہو رہی ہیں۔ اہ روایتی شاعری سے ہٹ کر جدید شاعری میں رشحات قلم صرف کرتے ہیں۔ بقول شہریار "وہ ان معدودے چند غزل گو شعراء میں ہیں جو جدید غزل کے تقاضوں سے بخوبی واقف ہیں" ظفر فتح پوری کا موبائل نمبر ۷۳۷۹۵۱۲۴۳۱ ہے۔

Urdu Quarterly
Adbee Nasheman
Lucknow - 226 003

Vol. 04 Issue 02
Mar - Apr - May 2021

RNI No. UPURD / 2017 / 74845
Per Copy : 25/-
Annaul Subscription : 125/-



دستاویز

شیخ بھکاری انصاری

قصبائی اور علاقائی طور پر تحریک آزادی کے ایسے ہزاروں انقلابیوں کے نام گمنامی کی تاریخ میں آج بھی گم ہیں۔جنہوں نے ملک کی آزادی کے لئے اپنی جان قربان کر دی۔ایسے مجاہدین آزادی کو مورخین نے نظر انداز نہیں کیا بلکہ اکثر مورخین کی رسائی ان قصبوں تک نہیں ہو پائی کچھ ایسے بھی مجاہدین ہیں جنہیں جو مقبولیت اور شہرت ملنی چاہئے تھی نہیں ملی۔ایسے ہی ایک مجاہد آزادی شیخ بھکاری انصاری بھی ہیں۔جن کا تعلق جھارکھنڈ کے رانچی ضلع کے ایک گاؤں سے ہے اچھی تعلیم و تربیت،خوش حال خاندان اور نقلابی ذہن کے شخص تھے۔20 برس کی عمر میں چھوٹا ناگ پور کے راجہ کی فوج میں اہلکار کے طور پر بھرتی ہوئے اور ترقی کر کچھ دنوں میں خبر رسانی کے کام پر معمور ہو گئے۔چونکہ شیخ بھکاری کا تعلق پارچہ بافی سے تھا لہٰذا انہوں نے پارچہ باف اور آدی واسی نوجوانوں کو یکجا کرانہیں فوجی تربیت دی اور راجہ کی فوج کو مستحکم اور منظم کیا اس کے علاوہ انہوں نے قبائلیوں کی گوریلا تربیت یافتہ فوج بھی تیار کی جبکہ اپنے منصوبہ بند سازش میں انہوں نے ہندوستانی فوج اور دفاتر کے ملازمین کو بھی خفیہ طور پر شامل کیا۔وہ اپنے علاقے کی پیش بندی،فوج کی مستحکم کاری اور ہندوستانیوں کو غلامی سے نجات دلانے کے لیے بیدار کرنے میں لگے رہے کہ انقلاب 1857 کا بگل میرٹھ کی فوجی چھاؤنی سے بج اٹھا۔بھکاری انصاری کی رہنمائی میں چھوٹا ناگ پور،چائے باسا،دمکا ،سنتھال ، پرگنہ، ہزاری باغ اور رام گڑھ و قرب و جوار کے علاقلوں پر قصبہ کر تربیت یافتہ مجاہدین نے آزادی کا پرچم لہرا دیا ۔دوسری طرف بھکاری انصاری کے تربیت یافتہ پارچہ باف نوجوانوں نے رانچی میں تقریبا 45 گوروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ضلع پلامو کے لیفٹیننٹ کو شکست دے کر ضلع پر قبضہ کر لیا گیا۔انگریز بھکاری کی حکمت عملی اور بہادری سے اس قدر خوف زدہ تھے کہ انہوں نے یہاں بھی وہی حکمت عملی اختیار کی جو ٹیپو سلطان اور سیراج الدولہ کے ساتھ اپنائی تھی۔یعنی بھکاری انصاری کے ایک دوست کی غداری کی بنا پر پوسو پہاڑ کے غار سے انگریزوں نے گرفتار کر لیا اور 8 جنوری 1958 کو چوٹو پالو گھاٹی کے ایک پیڑ سے لٹکا کر پھانسی دے دی گئی۔بھکاری کی شہادت کے بعد انگریزوں نے راحت کی سانس لی۔اس وقت کے گورنر بنگال نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ ”وہ دن انگریزی حکومت کے لیے بڑا اہم دن تھا کیوں کہ اس دن ہندوستان کا دوسرا ٹیپو سلطان مارا گیا۔ابھی تک ہم نے جتنے باغیوں اور سرداروں کو مارا ہے شیخ بھکاری ان میں سب سے زیادہ خطرناک،بہادر،دور اندیش،مدبر اور انقلابی تھا“۔افسوس اس بات کا ہے کہ بھکاری انصاری کا خاندان آج مفلسی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔جس کی وجہ حکومت کی بے توجہی اور شہید بھکاری کی شخصیت کو نظر انداز کیا جانا ہے۔

□□□

Printed,Published & Prop. by **Ahmad Rashiq** at **Nomani Printing Press, Baroodkhana, Golaganj, Lucknow**
and Published at 544C/168, Almas Bagh, Hardoi Road, Lucknow **Editor: Dr. Saleem Ahmad**